شمارہ: 9
فروری ۲۰۱۲ء

ماہنامہ ماہِ نور دہلی

جلد: 7
ربیع الاوّل ۱۴۳۳ھ

نوٹ: رسالے کے مستقل قارئین اس جانب ضرور توجہ دیں کہ اگر ان کی ممبری فیس ختم ہوگئی ہو تو ادارہ کو جلد از جلد بذریعہ منی آرڈر روانہ کردیں تاکہ ان کی ممبری بحال رہے۔

مراسلت و ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ ماہِ نور
419، اُردو بازار، جامع مسجد، دہلی-110006

MAAH-E-NOOR Monthly
419, Urdu Bazar, Matia Mahal,
Jama Masjid, Delhi - 110006

E-mail:mahenoormonthly@gmail.com, Website : www.abulghaus.com

قیمت فی شمارہ	:	12 روپے
قیمت سالانہ	:	150 روپے
بیرونِ ممالک	:	20 ڈالر
لائف ٹائم ممبرشپ	:	5000 روپے
// // بیرون ممالک	:	300 ڈالر

Printer, Publisher & Owner
SYED ABUL HASAN

Published at:
2229, Star Offset Printing Press
Ahata Hajjan Bi, Rodgran, Delhi-6

Published from:
419, Urdu Bazar, Matia Mahal,
Jama Masjid, Delhi - 110006

فہرست مضامین

خصوصی موضوع: ہند-پاک تعلقات

ظفر آغا

مسلم ریزرویشن ایک تاریخی فیصلہ

کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے۔ جی ہاں! پچھلے ہفتے منموہن سنگھ حکومت نے مسلم ریزرویشن کے تعلق سے ہندوستانی سیاست کا وہ کفر توڑ دیا، جس نے 1947ء میں نہ صرف اس ملک کا بٹوارہ کروادیا تھا، بلکہ اس ملک کے ہندوستان کو ہندوستانی نظام کی نگاہ میں تقریباً اچھوت بھی بنادیا تھا، لیکن یہ سب کیسے اور کیوں ہوا ذرا بعد میں۔ پہلے ہوا کیا اور کیا ملا ہندوستانی مسلمانوں کو؟ قاری واقف ہوگا کہ پچھلے ہفتے منموہن حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ پسماندہ ذاتوں کو سرکاری مرکزی ملازمتوں اور سرکاری مرکزی تعلیمی اداروں میں جو 27 فیصد ریزرویشن ملتا ہے، اس میں سے 4.5 فیصد حصہ ملک کی اقلیتوں کے لیے ریزرو کردیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس 4.5 فیصد کوٹہ میں سب سے بڑی اقلیت مسلمان کا حصہ سب سے بڑا ہوگا۔ اس فیصلے کی خبر آتے ہی اس سلسلے میں متضاد بیانات اور ردعمل آنے شروع ہوگئے۔ حسب امید اس فیصلے سے سنگھ پریوار چراغ پا ہوگیا، بی جے پی نے دھمکی دے دی کہ اگر مسلمان کو کچھ دیا تو ملک میں خانہ جنگی پھیل جائے گی۔ مسلمانوں اور پسماندہ ذاتوں کے لیڈران کا اس سلسلے میں ملا جلا ردعمل آیا۔ ان دونوں گروہوں کی جانب سے یہ کہا گیا کہ فیصلہ تو قابل ستائش ہے، لیکن بقول مسلم لیڈران ''کوٹہ کم ہے''۔ دوسری جانب لالو پرساد اور شرد یادو جیسے لیڈروں نے بھی فیصلے کا خیر مقدم کیا، لیکن کہا کہ اقلیتوں کو منڈل کوٹہ سے نہیں الگ سے ریزرویشن دیجیے۔ الغرض اقلیتی کوٹہ کے تعلق سے جتنے منہ اتنی باتیں تھیں، لیکن جو سوال اس بحث میں دب کر رہ گیا وہ یہ تھا کہ مسلم ریزرویشن کے معنی کیا ہیں اور اس فیصلے سے آیا ہندوستانی مسلمان کو کوئی فائدہ ہوگا یا نہیں۔ کم اور زیادہ کی بحث سے بڑھ کر میرے نزدیک یہ بحث بہت اہم ہے کہ مسلم ریزرویشن کے فیصلے سے آیا اس ملک کی بنیادی سیاست پر کوئی فرق پڑے گا یا نہیں؟ اور اس کا جواب محض منموہن حکومت کے حالیہ فیصلے سے ہی نہیں بلکہ جدید ہندوستان کی مسلم سیاست کے تناظر میں طے کرنا ہوگا۔ تو آیئے ذرا اس سلسلے میں ہندوستان کی تاریخ کے اوراق پلٹیں۔

دراصل مسلم ریزرویشن کوئی آج کی مانگ نہیں ہے، بلکہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے یہ مانگ جنگ آزادی کے وقت اُٹھی تھی اور اگر یوں کہا جائے کہ اسی مانگ نے آگے چل کر 1947ء میں ملک کا بٹوارا بھی کروادیا تھا تو غلط نہ ہوگا۔ آخر ریزرویشن کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ ریزرویشن ملک کے نظام میں کسی مخصوص طبقے، گروہ، مذہبی فرقہ یا ذات کو کوٹہ کے ذریعہ حصہ دینے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ وہ قومیں جو پسماندہ ہوجاتی ہیں اور محض اپنی صلاحیت پر نظام سے اپنے حصے نہیں حاصل کرسکتی ہیں وہ کوٹہ یا ریزرویشن کے ذریعہ اپنا حصہ حاصل کرتی ہیں۔ چنانچہ مسلم لیگ کو جنگ آزادی کے دوران یہ خدشہ پیدا ہوگیا کہ مسلمان کو آزاد ہندوستانی نظام میں اس کا حصہ نہیں ملے گا۔ اسی بنا پر محمد علی جناح کی ایما پر انگریزوں نے Separate Electorate کے نام پر دلتوں اور مسلمانوں کو ملک کے جمہوری نظام، تعلیمی اداروں اور سرکاری نوکریوں میں ان کی آبادی کے تناسب سے کوٹہ دینے کا اعلان کیا۔ اس فیصلے کی مخالفت گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس پارٹی نے کی اور یہ کہا کہ ذات کی بنیاد پر تو کوٹہ ہوسکتا ہے، لیکن ایک سیکولر ملک میں مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی بنیادی نکتہ نے قبل آزادی کانگریس مسلم لیگ (بالفاظ دیگر اس وقت کی مسلم قیادت میں) اس قدر درار پیدا کردی کہ مسلم ریزرویشن کا معاملہ ہندوستان کی آزادی کے وقت تک حل نہیں ہوا۔ اس پر جناح نے یہ مانگ کردی کہ اگر آزاد ہندوستانی نظام میں ریزرویشن کے تحت مسلم حصہ نہیں تو بس پھر اس ملک کا بٹوارا کرکے مسلمان کا حصہ الگ کردو۔ باقی سب تاریخ ہے جس سے آپ واقف ہیں۔ لب لباب یہ کہ جناح مسلم ریزرویشن کے نام پر ملک کا بٹوارا کروا کر پاکستان بنا بیٹھے۔ یعنی غیر منقسم ہندوستان میں مسلم حصے کے نام پر 1947ء میں پاکستان بن گیا اور اس پاکستان کی مانگ Separate Electorate بالفاظ دیگر مسلم ریزرویشن کے نام سے شروع ہوئی تھی۔

اب آپ سمجھیے کہ آزاد ہندوستان میں مسلم ریزرویشن کے نام پر کیا ردِعمل ہوتا ہے۔ قیامِ پاکستان نے کانگریس سمیت تمام سیاسی نظام میں یہ فکر پیدا کر دی کہ جناح مسلمانوں کا حصہ لے کر پاکستان لے بیٹھے تو پھر اب ہندوستانی نظام میں اس ملک کا حصہ کیسا اور کیوں؟ بظاہر یہ بات صحیح تھی۔ بھائی جب آپ حصے کے نام پر گھر بانٹ کر اپنا حصہ الگ کر لیں تو پھر حصہ کیسا؟ لیکن حقائق کی بنا پر یہ بات صحیح نہیں تھی، کیونکہ وہ مسلمان جو پاکستان گیا ہی نہیں اس کا پاکستانی حصہ یا بٹوارے سے کیا لینا دینا۔ 1947ء کے بعد مسلم ریزرویشن کی جو بھی مانگ اُٹھی وہ اس ملک کے مسلمان کی مانگ تھی جو پاکستان نہیں گئے تھے۔

لیکن یہ کہنا تو بہت آسان تھا کہ مسلمان کو ریزرویشن کے تحت اس ملک کے نظام میں حصہ دو، پھر نظام کی اس فکر کو توڑنا کہ پاکستان کے نام پر مسلمان اپنا حصہ لے چکے تو یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ اور کانگریس صدر سونیا گاندھی کا یہی کمال ہے کہ انھوں نے ہندوستانی سیاسی وسماجی نظام میں موجود اس فکر کو توڑا ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد ہندوستانی نظام میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں ہے اور اس کام کے لیے کوئی معمولی جرأت نہیں درکار تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد مسلم ریزرویشن اس ملک کی ہندو نفسیات میں دوسرے بٹوارے کا خوف پیدا کر دیتا ہے۔ تب ہی تو یہ فیصلہ کرنے کی جرأت نہ جواہر لعل کو ہوئی اور نہ ہی اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کو ہوئی۔ منموہن-سونیا ٹیم نے نہ صرف ایک تاریخی فیصلہ کیا ہے، بلکہ اس فکر کو بھی چیلنج کیا ہے کہ جو قیامِ پاکستان کے بعد اس ملک میں مسلمانوں کے تناظر سے پیدا ہوگئی تھی۔ ظاہر ہے کہ کسی فکر کو چیلنج کرنا آسان نہیں ہے۔ سنگھ پریوار اس سلسلے میں یقیناً خانہ جنگی کے حالات پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ منموہن سنگھ، سونیا گاندھی اور راہل گاندھی کو اس بات کا اندازہ رہا ہوگا کہ مسلم ریزرویشن دینے کے بعد سنگھ پریوار ان جیسے نہ جانے کتنے شوشے اس کے خلاف کھڑے کرے، لیکن پھر بھی منموہن سنگھ نے یہ فیصلہ لیا۔ اس کے لیے وہ نہ صرف قابل ستائش ہیں، بلکہ ان کے اس جرأت مندانہ فیصلے کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

منموہن سنگھ کو غالباً اس مشکل کام میں آنے والی پریشانیوں کا اندازہ تھا۔ شاید اسی لیے وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے اس سلسلے میں اپنی پچھلی حکومت کے دوران ہی قدم اُٹھانا شروع کر دیا تھا۔ دراصل سچر کمیٹی کی رپورٹ ایک ایسی رپورٹ تھی، جس کے ذریعہ منموہن سنگھ نے اس ملک کے غیر مسلموں کو ہندوستانی مسلمان کی پسماندگی کا چہرہ پیش کر دیا۔ مسلمان کو تو اپنی پسماندگی کا احساس بخوبی تھا۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ کا مقصد غیر مسلموں کو یہ سمجھانا تھا کہ آزاد ہندوستان میں مسلمان کا Appeasement تو درکنار، مسلمان کو کچھ ملا ہی نہیں۔ پھر دو تین برس تک ملک میں سچر کمیٹی کا شور ہوا اور سب کو یہ پتہ چل گیا کہ آزاد ہندوستان میں تو سیاسی، سماجی، تعلیمی اور معاشی اعتبار سے مسلمانوں کی حالت دلتوں سے بھی بدتر ہوگئی۔ اس شور نے ملک کے غیر مسلموں میں آزادی کے بعد مسلمانوں کے تعلق سے پیدا ہوئی فرقہ پرست فکر کو کمزور کرنے کا کام کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس بات نے مسلم ریزرویشن کے فیصلے کا کام آسان کیا۔ ورنہ اب تک بی جے پی اقلیتی کوٹہ کے نام پر ملک میں آگ لگا چکی ہوتی۔ مسلم ریزرویشن کے تعلق سے سچر کمیٹی کی رپورٹ منموہن سنگھ کا ماسٹر اسٹروک تھا۔

الغرض کوٹہ کم ہے، محض 4.5 فیصد میں کیا بھلا ہوگا اور وغیرہ وغیرہ یہ تمام بحث ہوتی رہے گی۔ منموہن سنگھ کا کمال یہ ہے کہ اس فیصلے سے منموہن سنگھ نے اس فکر کو توڑ دیا کہ بٹوارے کے بعد ہندوستانی مسلمان کا نظام میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ نہ صرف ایک تاریخی فیصلہ ہے، بلکہ ایک انتہائی جرأت مندانہ فیصلہ بھی ہے، جس کے لیے منموہن-سونیا ٹیم قابل ستائش ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فیصلے کے مثبت نتائج بھی ہوں گے جن سے مسلمانوں کو آئندہ بہت فائدہ ہوگا۔ لیکن منموہن سنگھ نے اس فیصلے سے نہ صرف یہ طے کر دیا کہ مسلمان کو نظام میں حصہ ملنا چاہیے بلکہ یہ بھی طے کر دیا کہ ہندوستانی مسلمان پاکستانی نہیں، بلکہ اتنا ہی ہندوستانی ہے جتنے دوسرے ہیں۔ اس اعتبار سے مسلم کوٹہ کم ہی سہی، لیکن ایک تاریخی فیصلہ ہے جو مستقبل میں ہندوستانی مسلمان کی قسمت بدل دے گا۔ (بشکریہ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' 27 دسمبر 2011ء، بروز منگل)

zafar_agha@yahoo.co.in

منظومات

نعت پاک

مکاں مکاں ترا جلوہ ، زباں زباں ترا نام
نظر نظر میں ہے تمثال کہکشاں ترا نام

مہہ و نجوم میں ہے پرتوِ تجلّیِ حق
حصارِ ظلمتِ شب میں ہے ، ضوفشاں ترا نام

تمام ناموں میں افضل ہے تیرا اسمِ جمیل
کمال حسن ازل کا ہے آسماں ترا نام

سراپا نور ہے تو ، چشمِ حق نگر کے لیے
لبِ شعور پہ ہے حرفِ جاوداں ترا نام

جہاں میں جلوۂ حق الیقیں ہے تجھ سے
بہار خلد کا ضامن ہے بے گماں ترا نام

ہے وجہِ کُن فیکوں تیری ذات والا صفات
مثال جوہرِ تقدیرِ دوجہاں ترا نام

عطائے رحمتِ باری ترے طفیل سے ہے
بہارِ لطف و کرم کا ہے رازداں ترا نام

ہر ایک پھول میں ہے تیرے نام کی خوشبو
پسِ نسیمِ چمن ہے رواں دواں ترا نام

زمانہ اسمِ مبارک کی برکتوں کے نثار
ہے شش جہت کے لیے فیضِ بے کراں ترا نام

کلامِ پاک میں ہے ، تیری عظمتوں کا بیاں
وہاں وہاں تری رحمت ، جہاں جہاں ترا نام

خزاں رسیدہ گلستانِ زندگی کے لیے
بہ رنگِ فصلِ بہاراں ہے ، گل فشاں ترا نام

عیاں ہیں تجھ پہ ، حیات و ممات کے اسرار
حقیقتِ ابدی کا ہے ترجماں ترا نام

حضر ہو یا کہ سفر ، تیرا آسرا ہے فقط
نگاہِ خلقِ خدا میں ہے ، حرزِ جاں ترا نام

نہ کیوں ہو نام ترا ، تیرے نازؔ کے لب پر
خدا کا شکر کہ شاملِ اذاں ترا نام

پروفیسر نازؔ قادری
چرچ روڈ، چندوارہ، مظفر پور–842001

عقیدہ وقانونِ ناموسِ رسالت

سید عزیز جاوید قادری اشرفی ☆

قرآن سے گستاخانِ رسول کی سزائے موت کا ثبوت :

إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِينًا. (سورۃ الاحزاب، آیت:57)

ترجمہ: بیشک جو ایذا دیتے ہیں اللہ اور اس کے رسول کو ان پر اللہ کی لعنت ہے دنیا اور آخرت میں اور اللہ نے ان کے لیے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

مومن کے قاتل کے بارے میں ارشاد فرمایا:

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ. (سورۃ المائدہ، آیت:45)

ترجمہ: اور ہم نے توریت میں ان پر واجب کیا کہ جان کے بدلے جان، اور آنکھ کے بدلے آنکھ، اور ناک کے بدلے ناک، اور کان کے بدلے کان، اور دانت کے بدلے دانت، اور زخموں میں بدلہ ہے، پھر جو دل کی خوشی سے بدلہ کرادے تو وہ اس کا گناہ اتار دے گا اور جو اللہ کے اتارے پر حکم نہ کرے تو وہی لوگ ظالم ہیں۔

اِن آیات کی روشنی میں ثابت ہوا کہ جو اللہ تعالیٰ یا رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچائے وہ قتل کیا جائے گا کیونکہ مومن کے قاتل کی سزا بھی یہی ہے تو اللہ تعالیٰ یا محبوبِ ربّ کو ایذا پہنچانے والے کی سزا بھی سخت ہونی چاہیے کیونکہ یہ زیادہ بڑا جرم ہے اور مومن کو قتل کے علاوہ ایذا پہنچانے کی سزا قتل سے کم ہے۔ مومن کا قصاص اُس کے ورثا کا حق ہے وہ چاہیں تو لیں چاہیں تو معاف کریں لیکن کیونکہ حضور نبی کریم کو ایذا پہنچانے کی سزا یا معافی کا فیصلہ کرنا حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام ہی کا اِختیار ہے لہٰذا کوئی مسلمان اِسے معاف نہیں کرسکتا۔

احادیث سے گستاخانِ رسول کی سزائے موت کا ثبوت :

ابنِ شہاب نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ فتحِ مکہ کے روز جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو آپ کے سرِ اقدس پر خود (لوہے کی ٹوپی) رکھی ہوئی تھی۔ جب آپ نے خود اتاری تو ایک شخص آ کر عرض گزار ہوا کہ ابن خطل کعبے کے پردے سے لٹکا ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا: اسے قتل کردو۔

(صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث:1424، صحیح مسلم، کتاب الحج، 3295)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابورافع کے لیے چند آدمی بھیجے۔ پس وہ رات کے وقت اس کے گھر میں داخل ہوئے اور ان حضرات میں عبداللہ بن عتیک بھی تھے۔ اس وقت وہ سو رہا تھا اور اسی حالت میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

(صحیح بخاری، کتاب المغازی، حدیث:1209)

شفا شریف میں ہے کہ: ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب بن اشرف کو قتل کرنے کا حکم فرمایا اور اس کی نسبت آپ نے فرمایا: وہ اللہ عزوجل اور اس کے رسول کو ایذا دیتا ہے اور اس کی طرف اس شخص کو بھیجا جس نے دھوکہ دے کر بغیر دعوت اسلام قتل کردیا بخلاف اس کے سوا دوسرے مشرکین کے (کہ انھیں بغیر دعوت اسلام قتل کا حکم نہ فرمایا)۔ اس کی علت یہ بتائی کہ وہ آپ کو ایذا دیتا تھا تو یہ خصوصیت کے ساتھ اس پر دلالت کررہی ہے کہ اس کا قتل شرک کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اذیت وگستاخی کی بنا پر تھا۔“

شعبی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے روایت کی ہے کہ ایک یہودی عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سبّ وشتم کرتی اور آپ کی ہجو کیا کرتی۔ ایک شخص نے اُس کا گلا گھونٹ دیا یہاں تک کہ وہ مرگئی۔ پس رسول اللہ نے اُس کے خون کو کالعدم قرار دیا۔ (سنن ابوداؤد، کتاب الحدود، حدیث:957)

اِس حدیث میں بھی گستاخِ رسول کی سزائے موت بالکل واضح ہے۔

اجماعِ امّت سے سزائے موت کا ثبوت :

شفا شریف میں ہے: ”ابوبکر بن منذر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عام اہلِ علم کا اس پر اجماع ہے کہ جو نبی کریم کو گالی دے وہ قتل کردیا جائے۔“

اور جو علما اس کے قائل ہیں ان میں امام مالک بن انس، لیث، امام احمد اور اسحاق رحمہم اللہ وغیرہ ہیں اور یہی مذہب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

قاضی ابوالفضل (عیاض) رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قول کا اقتضا یہی ہے۔ ان علما کے نزدیک اس کی

☆ حیدرآباد، سندھ، فون: 0334-2644623، facebook.com/syedashraf

توبہ قبول نہ کی جائے اور امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب اور ثوری و اہل کوفہ اور اوزاعی وغیرہ رحمہم اللہ نے بھی مسلمانوں کے ساتھ ایسا ہی فرمایا ہے لیکن یہ سب فرماتے ہیں کہ یہ درست ہے اور اسی کے مثل ولید بن مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نقل کی ہے۔

علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی روایت کی مثل امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اصحاب سے نقل کیا کہ یہ حکم اس کے لئے ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص کرے یا آپ سے بیزار ہو آپ کی تکذیب کرے۔ اور سحنون رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ جو آپ کو گالی دے وہ مثل زندیق مرتد ہے۔ (شفا شریف جلد2، صفحہ 233، مطبوعہ مکتبہ اعلیٰ حضرت، دربار مارکیٹ، لاہور)

شفا شریف میں اسی صفحہ پر ہے: ''محمد بن سحنون رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ علما کا اجماع ہے کہ شاتمِ نبی اور آپ کی تنقیص کرنے والا کافر ہے اور اس پر عذابِ الٰہی کی وعید جاری ہے اور امت مسلمہ کے نزدیک اس کا حکم قتل ہے۔'' (شفا شریف جلد2، صفحہ 233)

شفا شریف ہی میں ہے: ''ابن قاسم رحمۃ اللہ علیہ نے 'عتبیہ'' میں کہا ہے کہ جو بھی آپ کو برا کہے یا گالی دے یا عیب جوئی کرے یا تنقیصِ شان کرے تو اسے قتل کر دیا جائے اور اس کا حکم امت مسلمہ کے نزدیک قتل زندیق کی مثل ہے کیونکہ بلاشبہ اللہ عزوجل نے آپ کی توقیر اور آپ کو بھلائی سے یاد کرنے کو فرض قرار دیا ہے۔'' (شفا شریف، جلد2، صفحہ 234)

ابو مصعب اور اویس رحمہما اللہ کی ایک روایت میں ہے کہ ہم نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فرماتے سنا کہ جس نے رسول اللہ کو برا کہا یا گالی دی یا عیب جوئی یا تنقیصِ شان کر دی خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر قتل کر دیا جائے اور اس کی توبہ قبول نہ کی جائے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب میں ہے کہ ہمیں اصحاب مالک رحمہم اللہ نے خبر دی ہے کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یا آپ کے سوا دیگر انبیا علیہم السلام کو گالی دی خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر قتل کر دیا جائے اور اس کی توبہ قبول نہ کی جائے۔''

اِختصار کی وجہ سے اِسی پر اکتفا کرتا ہوں کہ حق قبول کرنے والوں کے لئے ایک دلیل بھی کافی ہوتی ہے۔ جو لوگ مزید دلائل جاننا چاہیں 'شفا شریف' کا مطالعہ فرمائیں۔

اب قانونِ ناموسِ رسالت پر ہونے والے اعتراضات کے جوابات پیش کیے جا رہے ہیں:

اعتراض-۱: یہ قانون ظالمانہ (سخت) ہے، اِسے ختم کیا جانا چاہیے۔

جواب: کوئی بھی قانون ظلم کے خاتمہ کے لئے بنایا جاتا ہے اور جو ظلم جتنا بڑا ہو، اُس کے خاتمہ کے لئے اُتنے ہی سخت قانون کی ضرورت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ قتل کی سزا موت ہے کیونکہ اگر اِس کی سزا کوئی ہلکی، معمولی ہو تو یقیناً معاشرے میں امن قائم نہیں رہ سکے گا۔ دینِ اسلام میں انبیا و رسل علیہم السلام منبعِ ہدایت ہیں لہٰذا ضروری تھا کہ اُن کی عزت وعظمت کی حفاظت کے لئے قانون بھی سخت ہوتا کہ کسی کو اُن کی شان میں گستاخی کی ہمّت نہ ہو کہ اِنسان اُسی کام کے کرنے سے بچتا ہے جس کے نتیجے میں اسے نقصان کا خیال ہو، چنانچہ اس جرم کے ارتکاب سے روکنے کے لئے اس کے قانون کا سخت ہونا عقلاً وشرعاً دُرست ہے۔

اعتراض-۲: یہ ایک ڈکٹیٹر انسان کا بنایا ہوا قانون ہے، اِسے ختم کرنا چاہیے۔

جواب: پہلے سے موجود کسی قانون کو آئین کا حصہ بنانا، اُس قانون کو بنانا نہیں بلکہ نافذ کرنا کہلاتا ہے۔ یہ قانون شریعتِ اسلامیہ کا قانون ہے جو کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے ہے۔

اعتراض-۳: یہ قانون قرآن میں کہیں نہیں۔

جواب ۱: اس قانون کا ثبوت قرآن، احادیث اور اجماعِ امت سے اس مضمون کے شروع میں دیا جا چکا ہے۔

جواب ۲: اگر یہ اعتراض بالفرض مان بھی لیا جائے کہ یہ قانون قرآن میں نہیں تو بھی اِس قانون کے ثبوت میں بہت سی احادیث موجود ہیں اور اجماعِ امت بھی ہے لہٰذا جو شخص اُن احادیث اور اجماعِ امت کے ماخذ ہونے کا اِنکار کرے، ایسے شخص سے پہلے احادیث و اجماعِ امت کی حجت پر بات ہوگی نہ کہ قانونِ ناموسِ رسالت پر۔

اعتراض-۴: جو شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات پر عمل نہ کرے وہ بھی گستاخ ہے، لہٰذا اُسے بھی قتل کرنا چاہیے۔

جواب: یہ اعتراض محض جہالت ہے، کیونکہ نافرمانی اور گستاخی دو الگ چیزیں ہیں۔ یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات پر عمل نہ کرنا گناہ ہے لیکن کفر نہیں کیونکہ اس پر اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ عذاب کی وعید بیان نہیں فرمائی جبکہ کفار کے لئے دائمی عذاب کی وعید ہے۔

کفار کے لئے فرمایا: **مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَن يَعْمُرُوا مَسَاجِدَ اللَّهِ شَاهِدِينَ عَلَىٰ أَنفُسِهِم بِالْكُفْرِ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ.** (سورۃ التوبۃ، آیت:17)

ترجمہ: مشرکوں کو نہیں پہنچتا کہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں خود اپنے کفر کی

گواہی دے کر ان کا تو سب کیا دھرا ضائع ہے اور وہ ہمیشہ آگ میں رہیں گے۔

اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی کرنے والوں کے لئے بھی اعمال کے ضائع ہو جانے کی وعید ارشاد فرمائی:

يَآ اَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ. (سورۃ الحجرات، آیت:2)

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنی آوازیں اونچی نہ کرو اس غیب بتانے والے (نبی) کی آواز سے اور ان کے حضور بات چلّا کر نہ کہو جیسے آپس میں ایک دوسرے کے سامنے چلّاتے ہو کہ کہیں تمہارے عمل ضائع نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر نہ ہو۔

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ذرا بھی بے ادبی کفر ہے کیونکہ اعمال صرف کافر کے ہی ضائع ہوتے ہیں جیسا کہ پہلی آیت میں بیان ہوا۔

جبکہ مسلمان کے لئے فرمایا:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذ ظَّلَمُوا أَنفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَّحِيمًا (سورۃ النساء، آیت:64)

ترجمہ: اور ہم نے کوئی رسول نہ بھیجا مگر اس لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے اور اگر جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کریں تو اے محبوب! تمہارے حضور حاضر ہوں اور پھر اللہ سے معافی چاہیں اور رسول ان کی شفاعت فرمائے تو ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں۔

اس آیت میں گناہ کرنے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہونے کی شرط پہلے ہے اور پھر توبہ کی شرط ہے اور یہ بھی فرمایا کہ اگر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت فرمائیں تو اللہ تعالیٰ کو بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان پائیں گے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السّلام کی نافرمانی گناہ ضرور ہے لیکن کفر نہیں، ورنہ پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آنے کا حکم نہ ہوتا، نہ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم شفاعت فرماتے بلکہ توبہ کا حکم ہوتا۔ یاد رہے کہ اس کے بیان کرنے کا مقصد کفر و نافرمانی کا فرق بیان کرنا ہے نہ کہ نافرمانی پر ڈٹے رہنے کی ترغیب۔

اعتراض-۵: حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے گستاخوں کو معاف فرمایا۔

جواب: یقیناً حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گستاخوں کو معاف فرمایا لیکن یہ خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا حق تھا کہ جسے چاہیں معاف فرمائیں اور جسے چاہیں قتل کروائیں جیسا کہ احادیث سے ثبوت میں بیان ہوا۔ اگر کسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس سنت پر عمل کرنا ہے تو وہ اپنے مخالفین کو معاف کرے نہ کہ حضور کے گستاخوں کو۔ اِس لئے آج اگر کوئی گستاخی کرتا ہے تو کوئی اُس کے لئے یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسے معاف فرما دیا ہے، کیونکہ ایسا کوئی ذریعہ نہیں جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آج کے گستاخوں کو بھی معاف فرمایا ہے، اِس لئے امت کا اجماع ہے کہ گستاخِ رسول قتل کیا جائے گا۔

اعتراض-٦: اِس قانون کا غلط استعمال کیا جا رہا ہے، لوگ اِس کا غلط استعمال کر رہے ہیں لہٰذا اِسے ختم کر دینا چاہیے۔

جواب: ایسا کون سا قانون ہے جس کا غلط استعمال نہیں ہو رہا لیکن کیا کوئی عقلمند یہ مطالبہ کر سکتا ہے کہ اُس قانون کو ختم کر دینا چاہیے؟ یا اُس قانون پر صحیح طور عملدرآمد کروانے کا مطالبہ کرنا چاہیے؟ یہ ذمّہ داری حکومت کی ہوتی ہے کہ قانون پر صحیح طور سے عملدرآمد کروایا جائے۔

رہا یہ کہ اس کا غلط استعمال ہو رہا ہے۔ اس کا غلط استعمال کرنے والوں کا حکم علما سے معلوم کرنا چاہیے نہ کہ کچھ لوگوں کی غیر ذمہ داری کی وجہ سے صحیح اور شرعی قانون کو اعتراضات کا نشانہ بنانا چاہیے۔

آخر میں یہ عرض کرتا چلوں کہ جو نام نہاد روشن خیال لوگ ناموسِ رسالت کے قانون کے مخالفین کے قتل کی مذمت کرتے ہیں وہ یہ بھی جان لیں کہ یہ کوئی معمولی قانون نہیں کہ جس کا جی چاہے وہ اپنی زبانِ طعن دراز کر دے۔ یہ ایک انتہائی حساس معاملہ ہے جس پر کلام کرنا دین کا علم رکھنے والوں ہی کا کام ہے، کوئی بھی دین سے لاعلم شخص اس بارے میں اپنی رائے دینے کی کوشش نہ کرے بلکہ اسے سمجھنے اور جاننے کی کوشش کرے اور اس میں سوال کرنے کی حدود بھی علما سے معلوم کر لے کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی دائرۂ اسلام سے خارج کر سکتی ہے جو کہ ارتداد کہلاتا ہے اور ایسا شخص مرتد کہلاتا ہے اور مرتد کی سزا قتل ہے۔ اس لئے دین کے معاملے میں بے احتیاطی سے کام لیتے ہوئے اپنی زبانِ طعن دراز کرتے ہوئے اُلٹا سیدھا بکنا یقیناً جہالت اور خود کو ہلاک کرنے والا کام ہے اور اس پر علما و عوام میں اشتعال بھی کوئی انوکھی بات نہیں کیونکہ ہر معاملہ کی حساسیت ایک جیسی نہیں ہوتی اور ایسا سمجھنا بھی یقیناً بے وقوفی ہے۔ □□

سب سے بہتر عبادت نماز ہے

محمد افروز عالم اشرفی☆

نماز کی اھمیت:

تمام عبادات میں نماز کو ایک امتیازی حیثیت ہے۔زکوۃ صاحبِ نصاب پر ایک سال میں ایک بار فرض ہوتی ہے اور رمضان کے روزے بھی گیارہ مہینے گزارنے کے بعد آتے ہیں مگر نماز ایک ایسی لازوال عبادت ہے جو تمام امیر وغریب پہ بغیر امتیاز کے فرض ہوتا ہے۔یعنی وہ عبادت ہے جو تمام صغیر وکبیر، امیر وغریب پر ایک دن میں پانچ مرتبہ فرض ہے۔ یہ وہی عبادت ہے جس کے متعلق حکم ہے کہ بچہ سات سال کا ہوجائے تو نماز کی پابندی کراؤ اور اگر دس سال کا ہوجائے تو مار مار کر پابندی کرائی جائے۔یہ وہی عبادت ہے جس کے متعلق قیامت کے دن سب سے پہلے پوچھا جائے گا۔**ان اوّل مایُحاسبُ به العبد یوم القیامة صلاته.** (نسائی) نماز ہی وہ عبادت ہے جس کو اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذمّے میں لے لیا اور برملا اعلان کردیا ہے۔**من ترک الصلوٰۃ متعمدا فقد برئ من ذمة محمد علیه السلام** (رواہ احمد والبیہقی) یعنی جس نے نماز کو جان بوجھ کر چھوڑ دیا وہ محمد علیہ السلام کے ذمے سے آزاد ہوجائے گا۔ اگر کوئی نبی کے ذمے سے آزاد ہوجائے گا تو کس کے پاس جائے گا کس کا دروازہ کھٹکھٹائے گا۔

اور دوسری جگہ اللہ کے رسول فرماتے ہیں:**ان الصلوٰت کفارة لما بینھن مااجتنبت الکبائر** (رواہ مسلم) یعنی بے شک نماز کفارہ ہے ان کی گناہوں کا جس کو انھوں نے کیا۔کہیں پر ارشاد ہوتا ہے:**الصلوٰۃ عماد الدین فمن ترکھا فقد ھدم الدین** (رواہ البیہقی) نماز دین کا ستون ہے تو جس نے ان کو چھوڑ دیا تحقیق کہ انھوں نے دین کو ڈھادیا۔

میرے بھائیو دیکھا آپ نے نماز کے چھوڑنے پر کیا وعید کی گئی گویا کہ نماز چھوڑنے کو دین ڈھادینے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔آپ دن بھر میں کتنی نمازیں چھوڑا کرتے ہیں اور کتنی مرتبہ مساجد کا رُخ نہیں کرتے، اپنا محاسبہ کیجیے۔اس لیے کہ آقائے نامدار فرماتے ہیں **فقد ھدم الدین** بیشک دین کو ختم کردیا۔دین کے ستون کو گرادیا اپنے نبی کے اقوال کا اُلٹا کیا۔اس سے بڑھ کر ترکِ نماز کی اور کیا وعید ہوسکتی ہے؟ میرے بھائیو! اب بھی موقع ہے کہ نماز کا دامن تھام لو، نماز کے خرمن میں اپنا بسیرا کرو، نبی کے اقوال کو اپنی زندگی کا سرمایہ سمجھو۔جس نے نماز کو ضائع کیا بے شک وہ کل قیامت کے دن فرعون وہامان کے ساتھ ہوگا اور جوان کافرنوں بدبختوں کے ساتھ ہوگا وہ اپنا انجام سمجھ لے۔رسول مدنی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:**من حافظ علی الخمس باکمال طھورھا و مواقیتھا کانت له نورا و برھانا یوم القیامة و من ضیّعھا حُشر مع فرعون و ھامان** (رواہ احمد) یعنی جس نے نماز کو مکمل طہارت کے ساتھ اور اس کے اوقات کے ساتھ پابندی کی تو ان کے لیے قیامت کے روز اللہ کا نور اور برہان ہوگا اور جس نے اس کو ضائع کیا تو فرعون اور ہامان کے ساتھ اس کا حشر ہوگا۔

دیکھا آپ نے فرعون وہامان کے ساتھ ہونے کی وعید بتائی گئی اور ساتھ ہونے کے متعلق آگے فرماتے ہیں:**من تشبّه بقوم فھو منه** جس نے کسی قوم کی مشابہت کی وہ اسی میں ہے گویا کہ آپ فرعون کی مشابہت کررہے ہیں تو بے شک آپ اس میں سے ہوں گے۔اگر آپ ان سے بچنا چاہتے ہیں تو نماز کا دامن تھام لو اور کثرت سے نمازیں پڑھو۔جانتے ہو نماز پڑھنے سے کیا کیا اَجر ملے گیں، اللہ تعالیٰ کے کیا کیا انعامات ہم پر ہوں گے، تو سنیے امام الانبیاء سرور قلب وسینا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: **اذا قام العبد الی صلاته فکان ھواہ ووجه و قلبه الی اللّٰه عز و جل انصرف کیوم ولدته امه** (احیاء علوم الدین) یعنی جب بندہ خشوع وخضوع کے ساتھ نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اس کی خواہش اور ان کا دل اللہ کی طرف رہے تو وہ لوٹے گا اس دن کی طرح جس دن اس کی ماں نے اس کو جنی ہو۔الحمدللہ نمازی کا نماز پڑھنے کا انعام دیکھیے گویا کہ نومولود بچے کی سی ہے اور اگر نومولود بچہ ہوتا ہے وہ تمام گناہوں سے پاک ہوتا ہے، اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔اور جس نے نماز کو عمداً ترک کیا گویا کہ اس نے کافروں جیسا کام کیا۔آقا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:**من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر** جس نے نماز کو جان بوجھ کر چھوڑا تحقیق کہ انھوں نے کفر کیا۔

گناھوں کا بدن سے جھڑنا:

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبیوں

☆متعلّم جامعۃ الاسلامیۃ الہدایہ، کیرالہ

کے سردار، ساقیِ کوثر جناب احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم موسم خزاں میں سیر کے لیے تشریف لے گئے تو دیکھا کہ خزاں رسیدہ بنے درختوں سے پتّے نیچے خود بخود گررہے ہیں۔ آپ نے ایک درخت کی دو شاخوں کو اپنے مقدس ہاتھوں سے پکڑ کر ارشاد فرمایا: اے ابوذر! انھوں نے عرض کی حاضر ہوا یا رسول اللہ، تو آپ نے فرمایا: بندہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا کی خاطر نماز پڑھتا ہے تو اس کے جسم سے گناہ ایسے جھڑ جاتے ہیں: کــمــا تھافت ھذا الورق عن ھذه الشجرة (مشکوٰۃ ص58) اور دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ: نمازی جب نماز پڑھتا ہے تو اس کے جسم سے تمام گناہوں کی میل دُھل جاتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی کے دروازے پر ایک نہر ہو اور وہ شخص دن میں پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو، کیا اس کے بدن میں میل باقی رہے گا؟ تو صحابہ کرام بیک زباں ہوکر بولے: نہیں اے اللہ کے مقدس رسول! تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: فذالک مثل الصلوٰۃ الخمس یمحو اللّٰہ بھن الخطایا. وہی مثال نماز پنجگانہ کی ہے اللہ تعالیٰ ان نمازیوں سے گناہوں کو مٹادیتا ہے۔

نماز ہی وہ عبادت ہے جو انسانوں کو گناہوں سے پاک کرتی ہے، وہی عبادت ہے جو پیام نفاست وطہارت دیتی ہے، نماز ہی وہ عبادت ہے جس سے بندہ کو رفعت ملی، محراب ومنبر کو عزت ملی، امام کو عظمت ملی، شاہ وگدا کو ایک کرنے کی ترغیب ملی اور شخصی امتیازی کو اکھاڑ پھینکا گیا:

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود وایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

نماز ہی بندگی ہے، نماز ہی اخلاقِ حسنہ کی ہادی ہے، نماز ہی الفت و محبت کا پیکر ہے، نماز ہی دین کا ستون ہے، نماز ہی الست بربکم کی مکمل تفسیر ہے، نماز ہی اللہ کے رسول کو راضی کرنے کی چیز ہے اور یہی بندوں کی معراج ہے اور یہی افضل عبادت ہے۔ حدیث میں ہے: سئل رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ای الاعمال افضل: فقال الصلوٰۃ لمواقیتھا. اللہ کے رسول سے پوچھا گیا کہ کون سا اعمال افضل ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا: نماز اس کے وقتوں پر۔ نماز ہی بندوں کو اللہ تعالیٰ سے اتنا قریب کراتی ہے کہ جب انسان خدا کو یاد کرتا ہے تو خدا فرماتا ہے:

فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ وَاشْکُرُوْلِیْ وَلَاتَکْفُرُوْنَ۔

تم مجھے یاد کرو میں تمھارا چرچا کروں گا اور شکر بجالاؤ اور ناشکری نہ کرو۔

کامیابی کا راز:

خالقِ کائنات کا ارشاد ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی وَ ذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی.

کامیاب وہ ہے جس نے پاکیزگی حاصل کی اور خدا تعالیٰ کا نام یاد کیا، پس نماز پڑھی۔

معلوم ہوا کہ بے نمازی ہر جگہ پر بدنام، ناکام ہوتے ہیں خواہ اسے دنیا میں کتنا ہی مال مل جائے مگر کامیابی اسے حاصل ہوگی جو خدائے وحدہٗ لاشریک کے سامنے سربہ سجود ہوجائے:

گرتو خواہی زیستن با آبرو
یاد اوکن ، یاداوکن یاد او

آپ کسی مالدار سے پوچھیں اور دریافت کریں تو معلوم ہوگا ہر وقت وہ پریشانیوں میں مبتلا رہتا ہے ہر وقت شورشِ قلب اس کو تڑپاتی ہے، اس پر بے چینی کا عالم ہوگا۔ دنیا کی ہر چیز فانی نظر آتی ہوگی، ہر تدبیر ناکام ہوگی اس پر ہمیشہ بے چینی چھائی ہوگی۔ جسم کے ہر سکنات میں تڑپ ہوگی مگر یقین جانو مسلمانو! سکون صرف اور صرف خدا کے ذکر سے حاصل ہوگا اس لیے کہ فرمانِ ربانی ہے: اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب یہی وجہ ہے کہ جب بندہ کو ہر طرف سے مصیبتوں کا ہجوم ہو تو ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے خدا فرماتا ہے: وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلوٰۃ۔ مدد مانگو صبر اور نماز سے۔ یہی وجہ ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی مشکل امر پیش آتا تو آپ نماز کی طرف رجوع کرتے تھے: "کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا حزن امر صلی (مشکوٰۃ117) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی سخت امر پیش آتا تو آپ نماز کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ تو معلوم ہوا کہ نماز ہی وہ عبادت ہے جو پروانۂ جنت بھی ہے اور بخشش کا سامان بھی، بدنی فعل بھی ہے اور روحانی طاقت بھی اور یہ وہی عبادت ہے جس کے چھوڑ دینے سے انسان عذابِ الٰہی میں گرفتار رہتا ہے۔

قرآن کریم میں ارشادِ خداوندی ہے کہ جب جنتی لوگ جنت میں اور جہنمی دوزخ میں چلے جائیں گے تو اہلِ جنت جہنم والوں سے سوال کریں گے: ماسلکم فی سقر تم کو کس چیز نے جہنم میں ڈال دیا۔ تو دوزخی جواب دیں گے: لم نک من المصلّین کہ ہم نمازیوں میں سے نہ تھے۔ اللہ اللہ! کتنی وعید شدید ہے اس کے لیے جس نے نماز کو چھوڑ دیا۔

اب آیئے ان حضرات کا تذکرہ بھی کر دیا جائے جنھوں نے اپنی زندگی میں نماز کو سستی کی وجہ سے ترک کر دیا ہو، کاہلی کے وجہ سے چھوڑ دیا ہوتو ملاحظہ کیجیے ارشاد خداوندی ہے اس کے لیے جس نے سستی کی وجہ سے نماز چھوڑ دیا:اَضَاعُوا الصَّلوٰۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّھَوَاتِ فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیّاً ۔جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور نفسانی خواہش کے پیچھے پڑ گئے سو وہ لوگ عنقریب خرابی پائیں گے۔اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ ان لوگوں کی سزا کا تذکرہ فرما رہا ہے جنھوں نے اپنی نفسانی خواہش کی تکمیل کی اور نماز کو ضائع کیا۔مفسرین کرام نے نماز ضائع کرنے کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ نماز کو اس کے اوقات میں نہ پڑھا۔صاحبِ تفسیر مظہری نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول نقل فرمایا کہ اَضَاعُوا الصَّلوٰۃَ کا مطلب ہے کہ اس کو گزار کر پڑھنا،یعنی اس کے اوقات میں ادا نہ کرنا۔

جن لوگوں نے نماز کو وقت پر ادا نہ کیا تو ارشادِ ربانی ہے:فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیّاً تو عنقریب خرابی پائیں گے۔'غیِ' کیا چیز ہے وہ کون سا مقام ہے۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جہنم میں ایک ایسی وادی ہے کہ جہنم کی گرمی اس سے پناہ مانگتی ہے۔بیہقی نے لکھا ہے کہ براء بن عازب نے فرمایا'غــی' جہنم کے اندر ایک گہری اور بدبودار وادی ہے۔(مظہری) دیکھا آپ نے نماز کو وقت پہ نہ پڑھنے کی سزا کیا ہے۔بے شک اس کو جہنم کی بدبودار وادی میں جھونک دیا جائے گا جس میں وہ گلتا رہے گا۔تو آپ خود ہی ملاحظہ فرمایئے کہ جو نماز سے غافل ہو اور نماز سے بالکل جدا ہو تو اس کی سزا کیا ہوگی۔اس کی سزا کے تعلق سے قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَۃً ضَنکا. اور جس نے میرے ذکر سے روگردانی کی بے شک ان کے لیے تنگی کا جینا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول نے فرمایا کہ اس سے مراد عذابِ قبر ہے اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس کو زمین یوں دبائے گی کہ اس کی پسلیاں اِدھر سے اُدھر نکل جائیں گے۔

ان مذکورآیات سے معلوم ہوا کہ نماز کو ترک کرنے والا،نماز میں سستی کرنے والا، خدا کے ذکر سے غافل ہونے والا مستحق عذاب ہے۔ان کا عذاب خطرناک ہے مگر ان سب کے باوجود آج ہماری ملّت کا حال ہی الٹا ہے۔جوابازی ہمارے اندر، شراب نوشی ہمارے اندر، زنا کاری ہماری عادت بن چکی ہے۔مسجد ویران ہیں، خدا کی یاد سے غافل ہیں، خدا کا خوف نہیں اور نہ ہی شرم۔علامہ اقبال نے مسلم معاشرے کی حالتِ زار پہ آنسو بہاتے ہوئے کہا تھا::

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایمان کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی تھا برسوں میں نمازی بن نہ سکا

آبادی تو ہے مگر حی علی الصلوٰۃ کی بلند آواز پر چند گنے چنے ہی لوگ مسجد کا رُخ کرتے ہیں، ان میں بھی اکثر بوڑھوں کی جماعت ہوا کرتی ہے۔وہ ایسے ہوتے ہیں جن کو ایک دھکا دے دیا جائے تو ان کی کمر ٹوٹ جائے گی، ان کا عینک ٹوٹ پھوٹ جائے گا، وہ بے چارے سڑک کو اپنی ٹیڑھی لاٹھی کے سہارے پار کر کے مسجد پہنچتے ہیں اور پھر خدائے عزوجل کے عظیم گھر میں جسے ہم مسجد کے نام سے جانتے ہیں ان کے لیے مسکن شفقت کی بشارت دیتا ہے۔

جس نے اپنی پوری جوانی سرکشی وطغیانی میں گزار دی اور عالم پیری میں خدائے وحدہٗ کی طرف رجوع ہوا ان کے لیے یہ لمحات قیمتی ہیں اور ان باعثِ فخر بھی کہ تمام زندگی گناہوں میں گزاری مگر عالم لاغری میں توبہ کر رہا ہے۔خداوند قدوس نے توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھولا ہوا ہے۔ ہر وقت توبہ کا دروازہ ان کو آواز دے رہا ہے، جو کوئی بھی بھولا بھٹکا انسان اپنی زندگی کے کسی لمحہ میں صدقِ دل سے توبہ کرے تو شرف قبولیت سے نوازا جائے گا۔

مگر جو توبہ بڑھاپے میں کی جاتی ہے وہ بہ نسبت جوانی کے جداگانہ ہے اس لیے کہ گناہوں کی توبہ عالم شباب میں کی ہوتی تو یہ انسان کو ولادت کے درجہ تک پہنچا دیتا ہے۔جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے:

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری
وقت پیری گرگ مے شود پرہیز گار

جوانی میں توبہ کرنا پیغمبر کا طور وطریقہ ہے اس لیے اگر آپ جوانی میں توبہ کریں گے تو شاید وہ توبہ ولایت کے درجہ میں پہنچ جائے۔اور عالم پیری میں توبہ کرنا جبکہ سرکشی کی تاب نہ ہو، یقین جانیے اس وقت تو بھیڑیا بھی پرہیز گاری کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔درحقیقت صحیح معنوں میں توبہ وہ ہے جو عالم شباب میں کی جائے اور عالم پیری میں عبادت کا لطف وہی اٹھا سکتا ہے جس نے جوانی میں توبہ کی ہو اور عبادت کے لیے مساجد کا رُخ کیا ہو۔ آیئے آج ہی توبہ کریں اور خدائے وحدہٗ لاشریک کی طرف رجوع ہوں اور پکا عہد کرلیں کہ ہم ہمیشہ مسجدوں کو آباد کریں گے۔اللہ تعالیٰ ہمیں لکھنے پڑھنے سننے سنانے سے زیادہ عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔□□

جلوسِ محمدی کا مسئلہ — چند قابلِ غور پہلو

مولانا یٰسٓ اختر مصباحی☆

پیغمبر اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت دوشنبہ کے روز ہوئی۔ دوشنبہ ہی کو آپ کی بعثت وہجرت ہوئی اور وصالِ مبارک بھی دوشنبہ ہی کو ہوا۔ ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: دوشنبہ کے دن روزہ رکھنے کے بارے میں ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا، اسی دن مجھ پر وحی نازل ہوئی۔ (صحیح مسلم)

12 ربیع الاوّل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس خاکدانِ عالم میں جلوہ گر ہوئے۔ سیرتِ نبوی کے سب سے قدیم ومستند تاریخ نگار محمد بن اسحٰق یسار (ولادت 85ھ وصال 150ھ) نے یہی دن اور یہی تاریخ لکھی ہے۔ طبری و ابن خلدون جیسے مؤرخین نے بھی یہی لکھا ہے۔ سیرت کی مقبول کتاب المواہب اللدنیہ کے مؤلف علامہ احمد بن محمد قسطلانی (ولادت 851، وصال 923ھ) یہی دن اور تاریخ لکھنے کے بعد مسلمانوں کے درمیان رائج ایک مستحسن طریقہ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

(ترجمہ) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ طیبہ کے مہینہ میں اہلِ اسلام محافل وتقریبات منعقد کرتے ہیں۔ دعوتوں کا اہتمام اور شب ولادت میں صدقات وخیرات ان کا معمول ہے۔ اظہارِ فرح وسرور کرتے ہیں۔ خوب نیکیاں کرتے ہیں۔ ولادتِ طیبہ کے احوال وواقعات پڑھتے پڑھاتے ہیں، جس سے ان پر بڑی برکتیں نازل ہوتی ہیں۔ (المواہب)

حجازِ مقدس، یمن، عراق، شام، مصر لیبیا، ترکی، افغانستان، سمرقند، بخارا ودیگر بلادِ اسلامیہ میں قدیم روایات کے طرز پر آج بھی محافلِ ذکر ولادت کا انعقاد ہوتا ہے، جن میں ولادتِ رسول، فضائلِ رسول، سیرتِ رسول، دعوتِ رسول کا بیان ہوتا ہے اور مسلمان ذوق وشوق کے ساتھ انھیں سنتے اور سناتے ہیں۔ اظہارِ مسرت اور ادائے شکر نعمت کے لیے صدقات وخیرات کرتے ہیں اور یہ ساری چیزیں کتاب وسنت کی روشنی میں نہ صرف جائز بلکہ محمود ومستحسن ہیں۔ دین میں ان کی اصل اور حکم ہے اور ہر دور کے لحاظ سے اہلِ اسلام یہ امور خیر انجام دیتے رہے ہیں۔ جائز حدود کے اندر رہتے ہوئے شکل وہیئت کی تبدیلی سے اصل حکم پر کوئی اثر اور فرق واقع نہیں ہوتا۔

جس حادث وجدید چیز کا سنت وشریعت کے کسی حکم اور کسی اصل سے تصادم ہو، اسے اصطلاحِ شریعت میں بدعت کہا جاتا ہے۔ یہ بدعت بھی اعتقادی ہوتی ہے اور کبھی عملی ہوتی ہے۔ جیسے خاتمیتِ نبوتِ محمدی کے مسلمہ عقیدہ میں تاویل، افضلیت وخلافتِ ابوبکر وعمر کا انکار، خلقِ قرآن اور قِدمِ عالم کا نظریہ، تجسیم وتشبیہ وامکانِ کذب باری تعالیٰ کا اعتقاد، علوم وصفات رسول علیہ السلام کی تنقیص، طریقت کے نام پر احکام شریعت کا استخفاف، غیر اللہ کے لیے سجدۂ تعظیمی کا جواز، تقریبات میں اسراف وتبذیر، فرائض وواجبات سے غفلت اور مباحات ومندوبات میں انہماک وغیرہ وغیرہ۔

مبادی ومعتقداتِ اسلام نہایت جامع وکامل ومکمل ہیں۔ ان میں کسی ترمیم وتغیر اور حذف واضافہ کی گنجائش نہیں۔ کتاب وسنت وکتب دینیہ میں اعتقادی وعملی احکام اسلام اجمالاً وتفصیلاً مسطور ومذکور ہیں۔ فقہ اسلام کے اصول وضوابط اور مسائل وجزئیات صدیوں پہلے مدون ومرتب ہو چکے ہیں۔ اور سارا عالم اسلام ان سے واقف اور ان پر عامل ہے۔ سنت وشریعت سے انحراف اور ان میں کسی قسم کی آمیزش بدعتِ ضلالت ہے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جس میں اہلِ حق کا ذرا بھی اختلاف اور ان کے درمیان کہیں بھی دو رائے نہیں۔ سنتِ رسول وسنتِ خلفائے راشدین کی اتباع کا یہی مطلب ہے اور سنت و شریعت کا یہی مطلوب ومقصود ہے جسے ہر لمحہ پیشِ نظر رکھنا ہر مسلمان کے اوپر لازم ہے۔

عہد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو بھی نئی چیز عالمِ ظہور میں آئے اس کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار یہ ہے کہ سنت وشریعت کی اصل اور ان کے دائرہ میں ہو اور کسی اصل وحکم کے معارض ومتصادم نہ ہو تو جائز ہے ورنہ ناجائز ہے۔ بدعات ومحدثات امور کے قبول وانکار کا یہی ضابطہ اور معیار علمائے اسلام ومحدثینِ کرام سے بتصریح ثابت ہے۔ اسی کے مطابق مسلمانانِ عالم کا عمل بھی ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں جس چیز کو مسلمان بہتر سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی بہتر ہے۔

بدعت یعنی نئی چیز ناجائز وہی ہے جو سنت وشریعت کے حکم اور کسی اصل کے خلاف ہے۔ قدیم ومستند محدثین وفقہا علمائے اسلام مثلاً علامہ ابن حجر عسقلانی وعلامہ بدرالدین عینی، علامہ قسطلانی، امام نووی شافعی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، علامہ ابن عابدین شامی وغیرہم نے یہی تحریر فرمایا ہے۔

☆بانی وصدر دارالقلم، ذاکر نگر، نئی دہلی 110025

علامہ جلال الدین سیوطی شافعی حدیث کُلُّ بِدْعَۃٌ ضَلَالَۃ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (ترجمہ) اس سے ایسی نئی باتیں مراد ہیں جن کی صحت کی شہادت شریعت سے نہ مل سکے۔ (ص 234، جلد 2، حاشیہ سیوطی سنن نسائی)

خود مؤلف نیل الاوطار محمد بن علی شوکانی حضرت امام شافعی کا یہ قول نقل کرتے ہیں: (ترجمہ) نئی چیزیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو کتاب یا سنت یا اثر یا اجماع کے خلاف ہو اور یہی بدعتِ ضلالت ہے۔ اور دوسری وہ جس کی ایجاد میں کوئی خیر ہو۔ اس کے بارے میں امت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور یہ بدعتِ مذمومہ نہیں ہے۔ (ص 33، القول المفید)

بہت سی نئی چیزیں ایجادِ مستحسن کے حکم میں ہیں۔ عہدِ رسالت و عہدِ صدیقی میں باجماعت نمازِ تراویح کا معمول نہیں تھا۔ عمر فاروق کے دور میں ہوا جسے دیکھ کر آپ نے فرمایا: نِعْمَۃُ الْبِدْعَۃِ ھٰذِہٖ یہ کتنی اچھی بدعت (نئی چیز) ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ کے حکم سے ابوالاسود دوئلی نے عربی گرامر یعنی نحو کے قواعد وضع کیے جس کا جاننا آج عربی و عجمی ہر ایک کے لیے ضروری ہے۔ حجاج بن یوسف ثقفی کے حکم سے قرآن حکیم پر اعراب (زیر، زبر، پیش) لگایا گیا۔ آج اس اعراب کے بغیر قرآن حکیم چھپنے چھپانے کا تصور بھی نہیں ہے۔

ایمانِ مجمل، ایمانِ مفصل، چھ کلمے اور ان کی ترتیب، قرآن میں رکوع کی نشاندہی، تیس پاروں میں اس کی طباعت، رحل پر رکھ کر اسے پڑھنا ان چیزوں کا عہدِ رسالت و عہدِ صحابہ میں کوئی ذکر بھی نہ تھا۔

احادیثِ نبوی کی سند، ان پر جرح و تعدیل، صحیح و حسن و ضعیف وغیرہ کی تقسیم، سب نئی چیزیں ہیں۔ اصولِ حدیث کے قواعد و ضوابط نئے ہیں۔ فقہ اسلامی کے اصول اس کی تدوین سب نئی چیزیں ہیں۔ اسی طرح قرآن فہمی کے لیے وضع کردہ اصولِ تفسیر بھی نیا فن ہے۔ یہ وہ چیزیں کے لیے وضع کردہ اصولِ تفسیر بھی نیا فن ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کا مذہب اور علوم اسلامیہ سے تعلق ہے۔ ان نئے علوم و فنون اور امور دنیاوی کا شمار مشکل ہے جن کے جائز ہونے پر ساری دنیا متفق ہے۔

ایک نئی چیز محفلِ ولادت نبوی کا انعقاد بھی ہے، جس کی اصل ذکرِ رسول ہے اور یہ اصل قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ قدیم و جدید علمائے عرب کے علاوہ علمائے ہند میں دہلی کے شاہ عبدالحق محدث دہلوی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، شاہ ابوسعید مجددی دہلوی، شاہ ابوالخیر مجددی دہلوی وغیرہم اور سہارنپور کے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا عبدالسمیع بیدل سہارنپوری، حاجی عابد حسین قادری بانی مدرسہ اسلامیہ عربی دیوبند (موجودہ دارالعلوم دیوبند) وغیرہم جس کے جواز و استحسان کے قائل ہی نہیں بلکہ اس کے عامل بھی رہے ہیں۔ ان حضرات کی تحریرات و تصدیقات اس پر شاہد عدل ہیں۔ لیکن آج محافلِ میلاد کو بدعت کہا جا رہا ہے اور سہارنپور کے جلوسِ محمدی کو بزور طاقت روکا جا رہا ہے۔

عہدِ رسالت و عہدِ صحابہ میں عصرِ حاضر جیسی عظیم الشان و مزین مساجد نہیں تھیں، عمارت اور نصابِ تعلیم کے ساتھ دارالعلوم نہیں تھے۔ آج جیسے جلسہ و جلوس کا کوئی رواج نہیں تھا، سیمینار اور کانفرنس نہیں ہوتی تھیں، مدارس سے تکمیلِ علوم کے بعد سند نہیں دی جاتی اور دستار بندی بھی نہیں ہوتی تھی مگر ان میں سے کوئی چیز مسلمانوں کی نظر میں معیوب و مذموم نہیں، بدعت کہہ کر انھیں کو چھوڑنے کو تیار نہیں۔

1950ھ کی دہائی میں جماعت اسلامی پاکستان نے تزک و احتشام کے ساتھ غلافِ کعبہ تیار کرا کے جلوس کی شکل میں شہر شہر گھمایا اور مکہ مکرمہ بھیجا، اخبارات میں خوب چرچا ہوا، کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ تو بدعت ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس کا تحریری جواب دیا کہ بدعت نہیں ہے، اس میں کوئی چیز مزاجِ شریعت کے خلاف نہیں ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جماعت اہلِ حدیث کے علماء اپنی مذہبی شناخت کے لیے سلفی اور اثری لکھتے ہیں۔ موجودہ ائمہ حرمین شریفین کے دورۂ ہندو پاک کے وقت سلفی علماء پروپیگنڈہ کر کے دور دور سے نمازیوں کو شدِّ رحال کرا کے ان کے پیچھے نمازیں پڑھواتے ہیں یہ بھی بدعت نہیں ہے۔ دہلی سے سہارنپور تک کے مشہور مدارس ختم بخاری کے جلسے کراتے ہیں، یہ بھی بدعت نہیں ہے، تبلیغی جماعت کے سہ روزہ و چالیس روزہ چلّے اور گشت ہوتے ہیں، یہ بھی بدعت نہیں ہے۔ نمازِ عصر کے بعد بالالتزام تبلیغی نصاب و فضائل اعمال کا درس ہوتا ہے، یہ بھی بدعت نہیں، اپنے علما پر سیمینار کراتے ہیں، یہ بھی بدعت نہیں ہے، جمعیۃ علماء ہند کے جلسے اور کانفرنسیں ہوتی ہیں، یہ بھی بدعت نہیں ہے۔ بھوپال (انڈیا) رائے ونڈ (پاکستان) ڈھاکہ (بنگلہ دیش) میں سالانہ تبلیغی اجتماعات ہوتے ہیں یہ بھی بدعت نہیں ہے۔ جمعیۃ علماء کی قیادت میں کانپور میں ہر سال جلوسِ میلاد النبی نکلتا ہے یہ بھی بدعت نہیں ہے۔ مشہور دیوبندی عالم مولانا عبدالعلیم فاروقی کی قیادت میں لکھنؤ میں جلوس مدحِ صحابہ نکلتا ہے یہ بھی بدعت نہیں ہے۔

اگر بدعت ہے تو بارہ ربیع الاوّل کا جلوسِ محمدی! کیونکہ اس سے ایک جماعت کی بالادستی اور انا مجروح ہوتی ہے اور میلاد النبی کی محفلیں بھی بدعت ہیں تو صرف اس لیے کہ اس کے مفادات کو ضرب پہنچتی ہے:

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟

❑❑

دو عظیم المرتبت داعیانِ اسلام
علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی و علامہ ارشدالقادری

محمد رضا قادری مصباحی☆

بیسویں صدی عیسوی میں عالمی سطح پر اسلام کی دعوت وتبلیغ اور اصلاح وتذکیر کا سہرا متحدہ ہندوستان کی جس آفاقی شخصیت کے سر سجتا اور زیب دیتا ہے اور جس نے تعارف ودعوتِ اسلام کے وسیع میدان میں تاریخ عالم پر غیر معمولی اثرات ڈالے ہیں ان میں پہلا مقام مبلغ اسلام، علامہ شاہ عبدالعلیم قادری، صدیقی، میرٹھی مہاجرِ مدنی علیہ الرحمۃ (1892ء–1954ء) خلیفہ فقیہِ اسلام امام احمد رضا قادری برکاتی بریلوی قدس سرہٗ (1856ء–1921ء) کا ہے۔

مبلغِ اسلام کی غیر معمولی خدمات اور ہمہ گیر اثرات کا دائرہ بیسویں صدی کے نصفِ اوّل پر پھیلا ہوا ہے۔ آپ نے بین الاقوامی سطح پر معلوم دنیا کے بیشتر خطوں میں اسلام کو ایک زندہ اور ہر دور کے لیے قابلِ عمل مذہب کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ اسلام کے تعلق سے غیر مسلم ذہنوں میں پیدا ہونے والے بے جا اعتراضات کا سائنٹفک اسلوب میں جواب دے کر ان کے شبہات کو دُور کیا۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی آپ کا وہ مکالمہ ہے جو کینیا (جنوبی افریقہ) کے شہر ممباسہ میں مغربی دنیا کے مشہور فلسفی اور ڈرامہ نویس جارج برناڈ شا کے ساتھ پیش آیا۔ اس مکالمہ کی تفصیل خلیل احمد رانا (پاکستان) کی کتاب 'مبلغِ اسلام علامہ شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی قادری' میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس مقالہ کو انفارمیشن سینٹر آف دی انٹرنیشنل اسلامک مشنریز گلڈز نے انگریزی زبان میں "AShavian and AThecologian" کے نام سے شائع کیا ہے۔ (مبلغ اسلام، علامہ شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی قادری، خلیل احمد رانا، ص78، مطبوعہ کراچی، پاکستان 1994)

اجمالی تفصیل یہ ہے کہ برناڈ شا نے اسلامی نظام کے مختلف پہلوؤں پر چونکا دینے والے اعتراضات کیے، جن میں اسلام کا اقتصادی نظام، معاشرتی نظام، سیاسی وروحانی نظام، تعزیراتی اور جنگی نظام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ جب مبلغِ اسلام نے اپنی گفتگو سے برناڈ شا کو پورے طور پر مطمئن کر دیا تو بے ساختہ اس نے کہا: ''عبدالعلیم! اگر اسلام یہی ہے جس کی ترجمانی آپ نے کی ہے تو میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ مستقبل میں دنیا کا مذہب اسلام ہوگا۔''

(سرینام، یورپ اور امریکہ کا ایک معلوماتی سفر، خود نوشت وقائع، علاّمہ ارشدالقادری قدس سرہٗ)

غالباً مبلغ اسلام سے ملنے کے بعد ہی اس عظیم مفکر نے یہ تاریخی جملے کہے تھے:

"If any religion has the chance of ruling over England, nay Europe, within the next hundred years, if can only be Islam. I have always held the religion of Muhammad in high estimation because of its wonderful vitality if is the only religion which appears to possess the assimilating to the changing face of existence, which can make its appeal to every age."

(مولانا وحیدالدین خان، احیائے اسلام، ص51، مطبوعہ گڈ ورڈ بک ڈپو، نئی دہلی)

(اگر کوئی مذہب ہے جو اگلے سو سال میں انگلستان پر حکومت کرے، نہیں! بلکہ سارے یورپ پر تو وہ صرف اسلام ہوگا۔ میں نے محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کے مذہب کو ہمیشہ بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے کیونکہ اس کے اندر حیرت انگیز طاقت ہے۔ یہ واحد مذہب ہے جس کے متعلق میرا خیال ہے کہ اس کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ بدلتی ہوئی دنیا کو اپنے اندر جذب کر سکے جس کے اندر ہر دور کے اپیل ہیں۔)

بہت سی ایسی مسلم آبادیوں سے آپ کا گزر ہوا جہاں لوگ کسی عالمِ دین کی صورت دیکھنے کو ترستے تھے۔ آپ نے انھیں اسلام کے چشمۂ صافی سے سیراب کیا، مسجدیں بنوائیں، مدرسے قائم کیے پھر آگے بڑھے۔

ممبئی کے ساحل سے آبی جہاز کے ذریعہ آپ کا سفر شروع ہوتا، چلتے چلتے کسی جزیرہ میں اُتر جاتے، وہاں کی غیر مسلم آبادی کو جمع کرتے، اسلام کی حقانیت پر پُر زور تقریر ہوتی، لوگ آپ کی دعوت سے متاثر ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتے۔ کسی کسی جزیرہ میں تو دو دو مہینوں سے زیادہ قیام کرنا پڑتا۔ جب لوگ مسلمان ہو جاتے تو ان کی مذہبی تعلیم کے لیے مدرسہ اور عبادت کے لیے مسجد قائم کر دیتے، کسی کو اپنا نائب بنا دیتے اور آپ کا سفر آگے کی طرف بڑھ جاتا۔

بادباں حیران رہتا کہ یہ کیسا آدمی ہے! جب کسی جزیرہ میں جاتا ہے تو تنہا ہوتا ہے اور واپس ہوتا ہے تو سیکڑوں لوگوں کی بھیڑ الوداع کہنے کے لیے اس کے پیچھے ہوتی ہے۔

مستند سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ آپ کی دعوتی کوششوں کے نتیجہ میں 70 ہزار سے زائد غیر مسلم حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ جس میں اپنے وقت کا فلسفی بھی ہے اور مؤرخ بھی، سائنسداں بھی ہے اور سیاست داں بھی، وزراء بھی ہیں اور قانون داں بھی، اور عام انسان بھی۔ کیا سبب تھا کہ اس قدر کثرت کے ساتھ لوگ آپ کے ہاتھوں پر اسلام میں داخل ہوئے۔ اگر ہم صحیح معنوں میں اس راز کو دریافت کر لیتے ہیں تو عصرِ حاضر میں دعوت و تبلیغ کے بے شمار نئے امکانات اور مختلف طریقہ ہائے کار سے واقف ہو سکیں گے۔

دعوت کی راہ میں اگر ایک طرف مبلغِ اسلام کی ہمہ جہت، غیر معمولی مقناطیسی شخصیت لوگوں کے دلوں کو مسخر کر رہی تھی تو دوسری طرف مختلف و متنوع زبان و بیان پر آپ کی حیرت انگیز مہارت، سائنٹفک طرزِ استدلال، مدعو کی نفسیات سے گہری واقفیت، خدا کے غافل بندوں تک اس کے دین کو پہنچانے کا پُر خلوص جذبہ اور اپنے مشن سے جنون کی حد تک عشق۔ یہ وہ عناصر تھے جنھوں نے پُر خار وادیوں کو آپ کے لیے لالہ زار بنا دیا، جس آبادی اور جس راہ سے گزرے آپ کی روحانی خوشبو سے وہ معطر ہوتی چلی گئی۔ اسلام کی صدائے دل نواز سے صحرا و بیاباں گونج اٹھے اور بحر اٹلانٹک کو پار کرتے ہوئے امریکہ کے جزیروں میں آپ نے اسلام کی روشنی پھیلا دی۔ آپ نے کسی مخصوص خطہ کو اپنے دعوتی عمل کی آماجگاہ نہیں قرار دیا، کسی ایک قوم کو اپنا مدعو نہیں سمجھا، بلکہ پوری دنیا آپ کے دعوتِ عمل کی آماجگاہ تھی۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر خطے میں پیاسی روحوں تک اسلام کا چشمۂ صافی پہنچانا آپ اپنا دینی و مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ آپ کے طائر فکر نے کبھی سیلون و برما میں پرواز کی، کبھی آپ کے ابرِ کرم نے چین، جاپان اور سیام کے جزیروں پر بارانِ رحمت برسایا، تو کبھی ری یونین، مڈگاسکر، ماریشش اور انڈونیشیا کو سیراب کیا۔ آپ نے کبھی افریقہ کے صحراؤں کی بادہ پیمائی کی، تو کبھی ارضِ مقدس فلسطین و عراق، مصر اور حجاز کے ریگزاروں کو چوما، کبھی اسلام کا ہلالی پرچم روم و انگلستان، برٹش گیانا، ڈچ گیانا، ٹرینڈاڈ اور یونائٹیڈ اسٹیٹس آف امریکہ کی پیشانیوں پر نصب کیا تو کبھی کناڈا، فلپائن، ویسٹ انڈیز، فرانس اور سنگاپور کی فصیلوں پر لہرایا۔ [(الف) کتاب التصوف، شاہ عبدالعلیم صدیقی قادری، ماخوذ از تعارف مولانا شاہ فضل الرحمٰن الانصاری المدنی خلیفہ مبلغ اسلام شاہ عبدالعلیم صدیقی (ب) مقدمہ تبلیغ اسلام کے اصول اور فلسفے، از خورشید احمد سعیدی پاکستان]

بن کر منادی عشق کا حد جہاں تک تو گیا
اللہ رے ہمّت تری عبدالعلیم قادری

(مولانا بدر القادری مصباحی)

کوئی ان صعوبتوں کا اندازہ لگائے، ہوائی جہاز کی برق رفتاری کا عہد نہیں تھا، ابھی ٹیکنالوجی نے اتنی ترقی نہیں کی تھی، بادبانی کشتیوں کا دور تھا۔ بعض ملکوں کا سفر کرنے میں ہفتوں اور مہینوں لگ جاتے، لیکن حیرت ہے اس مردِ حق آگاہ قلندر صفت پر کہ نقل و حمل اور مواصلات کے اتنے محدود وسائل و ذرائع کے باوجود لاکھوں میل زمین کا سفر کیسے طے کیا؟

کوئی ان حوادث کا اندازہ کرے جو ان کے عہد میں واقع ہوئے۔ مشرق سے مغرب اور شمال سے لے کر جنوب تک پوری دنیا جنگِ عظیم اوّل (1914ء–1918ء) اور جنگِ عظیم ثانی (1939ء–1940ء) کے ذریعہ سلگائے ہوئے الاؤ میں جھلس رہی تھی۔ ادھر ہند و پاک کی تقسیم (1947ء) نے ایک ہنگامۂ محشر بپا کر رکھا تھا۔ ٹھیک اسی زمانے میں اسلام کا سفیر، ملت کا نگہبان، دین کا داعی ان شورش زدہ خطوں میں انسانیت کے ابدی پیغام، امن کے حقیقی مفہوم اور خدائے ذوالجلال کی صحیح پرستش کے طریقوں سے دنیا کو روشناس کرا رہا تھا۔ دنیا کی لاکھوں بے چین روحوں کو صحیح فلسفۂ زندگی، عدل و مساوات کے حقیقی تصور سے باہر کر رہا تھا، ہزاروں مارکسیوں اور کمیونسٹوں کو اسلامی نظریۂ ملکیت اور معتدل تصورِ مساوات کی برتری تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا اور یہ ثابت کر دکھایا کہ ان تمام نو پید مسائل کا حل صرف اسلام میں موجود ہے۔

آپ کی دعوت کی اثر انگیزی اور غیر معمولی نتیجہ خیزی میں جن عناصر کا دخل رہا ہے ان میں سب سے بڑا عنصر میری نگاہ میں مدعو قوم کی زبان کا استعمال ہے۔ آپ کی دعوت کی خصوصیت یہ تھی کہ جس ملک اور جس خطہ میں پہنچتے، دعوت کا کام وہاں کی زبان میں انجام دیتے، عربی، فارسی اُردو کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، چینی، جرمنی، پرتگالی اور مختلف سواحلی زبانوں پر آپ کو عبور حاصل تھا۔ جب دل کی بات مدعو کی زبان میں دل تک پہنچتی ہے تب اثر پیدا ہوتا ہے۔

بیسویں صدی کے اندر عالمی سطح پر دعوتی خدمات کے حوالے سے کوئی بھی شخصیت ان کا ہم پلّہ نظر نہیں آتی۔ بلاشبہ وہ اسلام کے ایسے شارح و ترجمان تھے جنھوں نے قرنِ اوّل کے داعیانِ اسلام کی یاد تازہ کر دی۔ اگر آپ کی تمام دعوتی خدمات کا احاطہ کیا جائے تو یقیناً کئی ضخیم جلدیں تیار ہو جائیں، لیکن ایسا ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ بہت سارے واقعات وہ ہیں جن کی حفاظت کا کوئی اہتمام نہ ہوا۔ مزید یہ کہ آپ کی زندگی کے بہت سے گوشے لوگوں کے سینوں میں دفن ہو کر رہ گئے۔ تاہم اپنی نئی نسل کو آپ کی دعوتی خدمات سے واقف کرانا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں، تاکہ امتدادِ زمانہ کے

ساتھ محفوظ سرمایہ بھی ضائع نہ ہوجائے۔ ذیل میں آپ کی تابناک اور قابلِ تقلید داعیانہ زندگی کے چند نقوش جن کو پھیلائیں تو چالیس سال پر پھیل جائیں اور سمیٹ دیں تو چند صفحات میں سما جائیں، ملاحظہ کریں۔

مبلغِ اسلام کی داعیانہ و قائدانہ زندگی کا آغاز عہد طالب علمی سے ہی ہو چکا تھا، بی اے کا پہلا سال تھا، 1914ء میں پہلی بار آپ نے برما اور رنگون کا سفر کیا، برما کے مشہور شہروں میں تقریریں کیں اور وہاں رہنے والے مسلم طلبہ کی ایک جماعت 'برما مسلم ایجوکیشنل کانفرنس' تشکیل دی۔ 1915ء میں مذکورہ کانفرنس کی خصوصی دعوت پر برما کا سفر کیا اور جلسے کی صدارت کی، اس کانفرنس میں پیش کیا گیا تاریخی خطبۂ صدارت آپ کی دعوتی سرگرمیوں کے لیے سنگ میل ثابت ہوا۔

1919ء میں مکہ مکرمہ جا کر پہلا حج کیا اور حرم شریف میں ایک سال تک درس قرآن و تفسیر اور درس حدیث دیتے رہے۔ وہاں کے علما و مشائخ کے ساتھ افادہ و استفادہ کرتے رہے۔ اسی سفر میں یتیموں کی دیکھ بھال کے لیے مدینہ منورہ میں 'دارالایتام' قائم فرمایا۔

1921ء میں مبلغِ اسلام نے انڈونیشیا کا سفر کیا۔ (مبلغ اسلام، خلیل احمد رانا، ص32)

1923ء میں سیلون (سری لنکا) تشریف لے گئے اور مختلف شہروں میں تقریریں کیں۔ کولمبو میں میمن حنفی مسجد کی بنیاد رکھی۔ یہ مسجد پورے ملک کی سب سے خوبصورت مسجد ہے۔ (مرجع سابق بحوالہ ماہنامہ منارٹ (انگریزی) کراچی شمارہ اگست 1973ء ص24) اس دورہ میں آپ نے کولمبو یونیورسٹی میں ایک بڑے جلسہ سے خطاب کیا۔ مشہور پادری پروفیسر ریورنڈ کنگ بیری نے اسی کانفرنس میں آپ کی تقریر سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا۔ (ہفت روزہ الفقیہ امرتسر 28/ستمبر 1929ء ص4) 1925ء میں دوسرا حج کیا۔

1927ء میں ہندوستان کے ایک مشہور بنگالی شاعر و مفکر کے مسلسل لکچرز نے انڈونیشیا کو الحاد کی طرف لانے کی مہم چھیڑ رکھی تھی۔ مبلغ اسلام نے انڈونیشیا کی سب سے بڑی تنظیم الجمعیۃ المحمدیہ کے پلیٹ فارم سے عیسائی مشنریوں، قادیانی حملوں اور الحادی فتنوں کا پوری قوت سے مقابلہ کیا۔ (مبلغ اسلام، خلیل احمد رانا، ص27)

1928–29ء میں ماریشش کی سرزمین پر قادیانی حملوں کا خاتمہ کیا اور حزب اللہ کی بنیاد ڈالی۔ اس دورہ میں بہت سے ہندو اور عیسائی مسلمان ہوئے جس میں فرانسیسی گورنر 'مروات' خصوصی طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ انھیں کے توسط سے مراکش کے مشہور لیڈر غازی عبدالکریم سے جیل خانہ میں ملاقات کی اور یہاں سے نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کا دورہ کیا۔ آسٹریلیا میں مشہور فاضل ڈاکٹر محمد عالم کو مبلغ بنایا۔ (مولانا یٰسین اختر مصباحی، امام احمد رضا اربابِ علم و دانش کی نظر میں۔ مطبوعہ ہند و پاک)

ملایا میں اسلام پر قادیانی حملوں کے اثر کو ختم کیا۔ عربی، اُردو اور انگریزی زبانوں میں تقریریں کیں، بہت سے یورپین لوگوں نے اسلام قبول کیا، بنکاک کی رائل لائبریری میں بدھ مت کے متعلق ریسرچ کی۔ (مبلغ اسلام، خلیل احمد رانا، بحوالہ ماہنامہ منارٹ (انگریزی) کراچی شمارہ اگست 1973ء)

1931–32ء میں سیلون کے اندر گرین پمفلٹ تحریک شروع کی اور آل ملایا مسلم مشنری سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔

7/اپریل 1931ء کو سنگاپور تشریف لائے۔ معززین شہر نے اپنے مہمان کا پھولوں کے ہار کے ساتھ پُر جوش استقبال کیا۔

اسی سفر میں مسٹر سچندرا ناتھ دت ایم.اے، ایل.ایل.بی، بیرسٹرایٹ لا، جو سنگاپور کے ممتاز بیرسٹروں میں سے تھے، مبلغ اسلام سے ملے، تقریریں سنیں، چند ملاقاتوں میں ایسے مسحور ہوئے کہ 3/مئی 1931ء یک شنبہ کی سہ پہر کو مدرسہ الجنید کے وسیع میدان میں ہزاروں مسلمین و غیر مسلمین کے سامنے بطیب خاطر مسلمان ہوئے اور اسلامی نام سراج النور دت رکھا گیا۔

اسی تاریخ میں شب 9 بجے ایک فاضل انگریز 'لیم ہیرلڈ سڈنس' آپ کے ہاتھوں پر مسلمان ہوا جس کا نام ولی الحق سڈنس رکھا گیا۔ (مبلغ اسلام، خلیل احمد رانا، و ماہنامہ اخبار اُردو اسلام آباد شمارہ مارچ 1992ء)

25/ستمبر 1931ء کو آپ ماریشش کی بندرگاہ پر پہنچے۔ جزیرہ کے لوگوں نے پرتپاک انداز میں آپ کا خیر مقدم کیا۔ جامع مسجد پورٹ لوئیس میں دو تقریریں ہوئیں۔ تقریر کے بعد ایک ملحد شخص جامع مسجد کے بھرے جلسہ میں مشرف باسلام ہو گیا۔

28/اپریل 1932ء کو جزیرۂ ماریشش کے ایک جلسہ میں 'اسلامی شادی اور طبقۂ نسواں پر اسلام کا احسان' کے عنوان پر فصیح و بلیغ انگریزی میں ایک گھنٹہ تقریر فرمائی۔ تقریر ختم ہوتے ہی ایک فرنچ نوجوان مسٹر رینالڈ آگے بڑھا اور بڑے ادب سے کہا: ''مجھے بھی اس مقدس دین میں داخل کر لیا جائے۔ آپ نے اس کا اسلامی نام محمد علی رکھا۔'' (مرجع سابق ص34-35)

1934-35ء میں مبلغ اسلام کے عظیم شاگرد جے ماجد نے سیلون سے ماہنامہ اسٹار آف اسلام (Star of Islam) جاری کیا۔ مبلغ اسلام نے ڈربن (جنوبی افریقہ) میں انٹرنیشنل اسلامک سروس سنٹر قائم کیا جہاں سے مشہور ماہنامہ The Muslim Digest اور The Five Pillars جیسے معیاری مجلّات پابندی سے شائع ہوتے ہیں۔ (ہفت روزہ، الفقیہ امرتسر 14/جون 1932ء ص9)

اسی سال آپ نے زنجبار، موزنبیق اور کینیا کا دورہ فرمایا اور وہاں کے مسلمانوں کو یورپین طاقتوں سے نبرد آزما ہونے کے تیار کیا۔

17/اپریل 1935ء کی تاریخ آپ کی زندگی کا ایک یادگار دن ہے۔ جب ممباسہ (افریقہ) میں مشہور ڈرامہ نویس جارج برناڈ شا سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ برناڈ شا نے اسلام کے مختلف مسائل پر گفتگو کی۔ آپ نے سائنس اور فلسفہ کی روشنی میں برناڈ شا کے سوالات کے ایسے جوابات دیے کہ دنیا کا عظیم فلاسفر اور مغرب کا عالی دماغ مفکر آپ کے سامنے گونگا ہو گیا اور آخرش اس کو اسلام کی عظمتوں کا اعتراف کرنا پڑا۔ (ماہنامہ منارٹ کراچی اگست 1973ء)

1936ء کو سنگاپور میں قیام کے دوران مشہور انگریزی رسالہ 'دی جینوئن اسلام' (The Genuin Islam) جاری کیا۔ اور اس کی ادارت اپنے لائق شاگرد ڈاکٹر ایچ ایس منشی کے ہاتھ میں دی۔

چین میں احیاء اسلام کا کام کیا۔ ہانگ کانگ میں ایک یتیم خانے کا سنگ بنیاد رکھا۔ جاپان کے مشہور شہر کعب کی جامع مسجد کمیٹی نے آپ کو دعوت دی۔ جاپان کے ہی مشہور شہر ٹوکیو میں 'دی کلٹیویشن آف سائنس بائی دی مسلمس' (سائنسی ایجادات میں مسلمانوں کا حصہ) موضوع پر آپ کی حیرت انگیز چونکا دینے والی تقریر ہوئی جس میں تاریخی حقائق کی روشنی میں اسلام اور مسلمانوں کی عظمت کو اس انداز میں ثابت فرمایا کہ جاپان کا سنجیدہ ذہن طبقہ اسلام کی خوبیوں کا معترف ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

(سلطنتِ مصطفیٰ کا سفیر، ص14، مؤلف مفتی نسیم اشرف حبیبی، ڈربل، ساؤتھ افریقہ)

1945ء میں ہندوستان کے بعض حصوں میں زبردست فسادات ہوئے۔ آپ نے پنڈت نہرو سے ملاقات کے دوران ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں پر ظلم و ستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا۔ بمبئی اور مدراس میں تقریریں کر کے مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی۔

(تذکرہ اکابر اہلِ سنت، مولانا عبدالحکیم شرف قادری مطبوعہ لاہور، 1976)

اسی سال دنیا بھر سے آنے والے مسلم قائدین سے حجاز مقدس کے احوال کو بہتر بنانے کے لیے آپ نے تبادلۂ خیال کیا۔ حج ٹیکس کے خاتمہ کے لیے شاہ ابن سعود سے ملاقات کے لیے بھیجے گئے ایک ہندوستانی وفد کی قیادت کی۔ مسلمانوں کے درپیش مسائل کے حل کے لیے علمائے عرب خاص طور سے علمائے ازہر کو ابھارا اور مصر میں ایک تبلیغی سوسائٹی قائم کی جس کا نام 'تعریف بالاسلام' رکھا۔ (سلطنتِ مصطفیٰ کا سفیر، مفتی نسیم اشرف حبیبی ڈربن، ساؤتھ افریقہ)

1948ء میں شاہ اردن عبداللہ بن سلیمان اور دوسری مشہور شخصیات کے ساتھ حجاز مقدس میں عوامی مالیات اور ان کی تنظیم کے مسائل پر گفت و شنید کی۔ (اکابر تحریک، محمد صادق قصوری، پاکستان مطبوعہ لاہور، 1976ء، ص144)

ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ کیے جانے والے وحشیانہ سلوک پر وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے 1949ء میں ملاقات کی۔ سنگاپور میں عید میلاد النبی کانفرنس کی صدارت کی اور لادینی افکار و نظریات بالخصوص کمیونزم کے خلاف مسلمان، ہندو، سکھ، یہودی اور عیسائی مذہبی رہنماؤں کا ایک متحدہ محاذ تشکیل دیا جس کا نام تنظیم بین المذاہب (Inter Religilous Organisation) رکھا۔ (مبلغ اسلام، خلیل احمد رانا، ص50) اس تنظیم کا مقصد خدا کے وجود پر یقین رکھنے والے مذاہب کے باہمی رابطہ کے ذریعہ لامذہبیت کا قلع قمع کرنا تھا۔

علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی نے مرزائیت کے رد میں اہم کارنامہ انجام دیا۔ علامہ شاہ احمد نورانی (1925ء-2004ء) فرزند مبلغِ اسلام جنھوں نے اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد عالمی سطح پر دعوتِ اسلام اور مسلمانوں کی مذہبی قیادت کا قابلِ فخر کارنامہ انجام دیا، ان سے لیے گئے ایک انٹرویو کا اقتباس ملاحظہ کریں:

''میرے والد نے ابتدا سے آخر تک افریقہ، ملیشیا، سیلون، یورپ اور امریکہ کی سرزمین پر بیشتر لوگوں کو اس فتنہ سے آگاہ کیا۔ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی انگریزی زبان میں تصنیف "The Mirror" کے نام سے موجود ہے، جو کہ پبلی کیشنز (ڈربن، جنوبی افریقہ) نے شائع کی ہے۔ اور اُردو زبان میں 'مرزائی حقیقت کا اظہار' اور عربی زبان میں مصر میں چھپی ہوئی 'المرآۃ القادیانیۃ' ہیں۔ انڈونیشی زبان میں 'مرزائی حقیقت کا اظہار' کا ترجمہ ہوا اور اس کی اشاعت کے بعد ملیشیا میں زبردست تحریک اٹھی۔ یہاں تک کہ ملیشیا میں مرزائیوں کا داخلہ تک ممنوع ہو گیا تھا۔''

(ارشاد احمد علیمی، حیات علیم رضا، مطبوعہ ساہیوال 1980ء)

1950ء میں امریکہ کے اس دلچسپ سفر کی کہانی مسٹر خلیل احمد رانا کی زبانی ملاحظہ کریں۔ لکھتے ہیں:

''مولانا عبدالعلیم صدیقی علیہ الرحمہ تبلیغ اسلام کے لیے امریکہ روانہ ہوئے جہاں آپ کی آمد کا شدت سے انتظار تھا۔ مشرقی یونائیٹڈ اسٹیٹس کے مفتی اعظم حضرت عبدالرحمٰن لسٹر آپ کے شاگرد ہوئے۔ شکاگو کے دوران قیام آٹھ امریکی مسلمان ہوئے۔ ایک دن شہر نیویارک کے سٹی ہال میں عالمانہ تقریر کی۔ جلسہ برخاست ہوتے ہی 92 امریکیوں نے اسلام قبول کیا، جن میں مشہور سائنس داں مسٹر جارج اینٹونوف اور ان کی بیگم شامل ہیں۔ واشنگٹن میں مختلف علمی اداروں میں لکچرز دینے کے بعد چھتیس امریکن دانشور و پروفیسرز اپنے اہل و عیال کے ساتھ مسلمان ہوئے۔

واشنگٹن میں ہی 'The solution of man's Prodlems' (انسانی مسائل کا حل) کے عنوان سے لا جواب تقریر کی۔"

(انٹرویو، مولانا شاہ احمد نورانی، ماہنامہ ترجمان اہلِ سنت کراچی، شمارہ اگست، ستمبر 1972ء)

میچی گن یونیورسٹی کا ہونہار ماہر تعلیم مسٹر عبدالباسط آپ کا شاگرد ہوا اور مولانا کی زیرسرپرستی امریکہ سے ایک بلند پایہ میگزین 'The Islamic World and the U.S.A' (اسلامی دنیا اور امریکہ) جاری کیا گیا۔ کناڈا میں گیارہ علمی اداروں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لکچر دیے۔ (اس تقریر کا اُردو ترجمہ 'حقیقی مسرت کی تلاش' کے نام سے ماہنامہ ترجمان اہلِ سنت کراچی نے مئی 1972ء کے شمارے میں شائع کیا)

ٹرینڈاڈ کی وزیر موریل فاطمہ ڈونا وانے آپ ہی کی تبلیغ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔ اس کے علاوہ ریاست سرواک (Sarawak) کی شہزادی گلڈیز یا مرخیر النساء، محمد حوسف مشل اور نہ جانے کتنی ممتاز شخصیات نے اس سفر میں اسلام قبول کیا۔ (مبلغ اسلام، خلیل احمد رانا، ص 54-53 بحوالہ امام احمد رضا ارباب علم و دانش کی نظر میں۔ از مولانا یٰسین اختر مصباحی، مطبوعہ کراچی)

اسی سفر میں مبلغ اسلام نے اسلام کی اشاعت کے ٹرینڈاڈ میں چھ ماہ تک قیام کیا۔ اس کے بعد برٹش گیانا، ڈچ گیانا، انگلستان، فرانس، روم، حجاز، مصر، ماریشش، ری یونین، مڈغاسکر، مشرقی افریقہ، سیلون، ملایا، سیام اور انڈونیشیا وغیرہ کا دورہ مکمل کر کے ڈھائی سال کے بعد 21/مئی 1951ء کو کراچی تشریف لائے۔ یہ دورہ کراچی ہی سے اکتوبر 1948ء کو شروع ہوا تھا۔ (ذکر حبیب از مبلغ اسلام: مطبوعہ المرکز الاسلامی بی بلاک شمالی ناظم آباد کراچی)

آپ کی خدمتِ دعوت و تبلیغ اور جنونِ شوق کی داستان یہیں آ کر ختم نہ ہوگئی بلکہ آخری دم تک اسلام کا سفیر بن کر دشت و کوہسار میں آپ آبلہ پائی اور صحرا نوردی کرتے رہے۔ خدا کے غافل بندوں کو لاہوتی نغمہ سناتے رہے۔ جنت سے قریب اور جہنم سے دُور کرتے رہے۔

1373ھ - 1953ء میں تبلیغی دورہ کے بعد حج و زیارت کے لیے عازم سفر ہوئے، مناسک حج کی ادائیگی کے بعد مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور دیارِ حبیب میں وصال کی آرزو لے کر وہیں مقیم ہوگئے۔ عشق و وارفتگی کے عالم میں بار بار یہ شعر پڑھتے:

علیم خستہ جاں تنگ آ گیا ہے دردِ ہجراں سے
الٰہی! کب وہ دن آئے کہ مہمانِ محمد ہو

23/ذوالحجہ 1374ھ مطابق 22/اگست 1954ء کو مدینہ منورہ میں آپ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور جنت البقیع میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے قدموں میں مدفون ہوئے۔ آپ کی نماز جنازہ عاشق رسول، عارف باللہ شیخ محمد ضیاء الدین احمد مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ خلیفۂ مجاز فقیہ اسلام امام احمد رضا قادری برکاتی قدس سرہٗ نے پڑھائی۔

(مقدمہ تبلیغ اسلام کے اصول اور فلسفے از خورشید احمد سعیدی پاکستان)

صدیقہ صدیق کے قدموں میں جنت پا گیا
صدیقیت سچی تیری عبدالعلیم قادری

(مولانا بدر القادری مصباحی)

مبلغ اسلام کی تصانیف ایک نظر میں:

1. The Elementary Teaching of Islam
2. The Principles of Islam
3. Quest For True Happiness
4. How to Face Communism
5. Islam's Answer to the Challenge of Communism
6. Women and their Status in Islam
7. A Shavian and Theologian
8. The Forgotten Path of Knowledge
9. The Codification of Islamic Low
10. How to Preach Islam
11. The Message of Peace
12. The Problems of Peace and Wak
13. The Mirror
14. The Clarion Call
15. Miracle in Light of Science and Religion
16. The First Teaching of Islam
17. Cultivation of Science by the Muslims
18. The Universal Teaching
19. Spiritual Culture in Islam
20. Religion and Scientific Process
21. المرآۃ القادیانیہ (عربی)
22. حقیقۃ المرزائین
23. ضرائب الحج
24. ذکر حبیب (اردو)
25. کتاب التصوف
26. بہارِ شباب
27. احکام رمضان
28. مرزائی حقیقت کا اظہار

داعیِ اسلام علامہ ارشد القادری قدس سرہٗ

برصغیر ہند کی دوسری عالمی شخصیت جو بیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں شمالی ہند کے اُفق سے مطلعِ اہلِ سنت پر طلوع ہوئی، وہ خلیفۂ قطب مدینہ رئیس القلم، قائد اہلِ سنت علامہ ارشد القادری مصباحی (1925ء-2002ء) کی ذات ہے جن کی دعوتی، تحریکی، تنظیمی اور قلمی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ اگر مبلغ اسلام علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھی کی خدمات کا دائرہ بیسویں صدی عیسوی کے نصفِ اوّل کو محیط ہے تو قائد اہلِ سنت علامہ ارشد القادری کی عملی جدوجہد کا دائرہ بیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کا احاطے کیے ہوئے ہے۔ دونوں کی خدمات کی نوعیت گو جداگانہ ہے لیکن زاویہ قائمہ کے دونوں اضلاع کو جو چیز باہم مثلث کرتی ہے وہ ان دونوں شخصیات کا داعیانہ وقائدانہ کردار ہے۔

قائد اہلِ سنت علامہ ارشد القادری نے ہندوستان کی شہرۂ آفاق درسگاہ دارالعلوم اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ، یوپی کے چمنستان علم سے خوشہ چینی کی تھی، ان کے ذہن کی ساخت، کانٹ چھانٹ اور صیقل گری حافظ ملت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث مبارک پوری علیہ الرحمۃ (وصال 1394ھ-1976ء) اور اساتذۂ اشرفیہ مبارک پور کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ سرکار حافظ ملت نور اللہ مرقدہٗ (خلیفۂ اعلیٰ حضرت سیّدنا ضیاء الدین مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ) نے انھیں سوجتن سے تیار کیا تھا۔

(1) حضرت علامہ ارشد القادری نے بھی اپنی دعوتِ وعمل کی جولان گاہ کسی ایک شہر، ایک ملک اور ایک براعظم کو نہیں بنایا۔ بلکہ ایشیا و یورپ کا ایک وسیع خطہ آپ کا بھی دائرۂ فکر وعمل تھا۔ ہر اس مقام پر اہلِ سنت و جماعت کا آپ کوئی قلعہ تعمیر کرنا چاہتے تھے جہاں کفر اور بدعقیدگی کے سایہ نے اپنا ڈیرہ ڈال رکھا ہو، ہر اس دشوار گزار مقام پر پہنچنا آپ اپنا فرض سمجھتے تھے جہاں قوی الاعصاب مردوں کی ہمتیں جواب دے جائیں۔

آپ کی شام وسحر اسلام کے روشن چہرہ پہ غیروں کی طرف سے ڈالے گئے غبار کو صاف کرنے میں گزرتی۔ زندگی کی ایک ایک سانس جماعت اہلِ سنت کی زلف برہم سنوارنے میں صرف ہوتی۔ آپ نے غیروں کی طرف سے سوادِ اعظم اہلِ سنت پر لگائے گئے الزامات کا اپنے خارا شگاف قلم سے ایسا جواب دیا جس کے زلزلہ نے ان کے شبستانِ وجود کو زیروزبر کر ڈالا۔ تقدیسِ الوہیت اور عظمتِ رسالت کے باب میں جن کے قلم گستاخ ہو چکے تھے ان کے چہروں پر زناٹے دار طمانچہ رسید کیا اور قلم کی نوک سے کفر کو ایسا تڑپا تڑپا کے مارا کہ نوکِ قلم پر خون کے دھبوں کے نشان تلاش کر پانا بھی مشکل ہے۔

حضرت علامہ ارشد القادری بیک وقت مدرس بھی تھے اور مصنف بھی، شاعر بھی تھے اور مناظر بھی، بے نظیر منتظم بھی تھے اور عالی دماغ مبلغ بھی۔ سیاست ہو یا صحافت، قیادت ہو یا خطابت آپ ہر میدان کے شہسوار تھے۔ انھیں اوصاف نے قائد اہلِ سنت علامہ ارشد القادری کو اپنے اقران سے ممتاز کر دیا تھا۔

(2) آپ کا دوسرا امتیازی وصف یہ ہے کہ آپ نے سہل اور نرم زمینوں میں کبھی قدم نہیں رکھا، بلکہ ہمیشہ اپنے لیے سنگلاخ، بنجر اور اعصاب شکن زمینوں کا انتخاب کیا۔ اگر آپ چاہتے تو کسی بند کمرے میں اپنے جسم کو قید کر لیتے اور رب کی تسبیح وتقدیس میں پوری عمر گزار دیتے، کوئی خانقاہ بنا کر دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر اس میں مقیم رہتے لیکن آپ کی افتادِ طبع نے اس قدر آسان زندگی کو پسند نہ کیا۔ امتِ مسلمہ کی زبوں حالی، جماعت کا داخلی وخارجی انتشار آپ سے دیکھا نہ گیا، فکر وقلم کی توانائی سے لیس ہو کر عزم وحوصلہ کی ناقابلِ تسخیر قوت لے کر اٹھے، مبارکپور سے چلے ناگپور پہنچے، مسندِ تدریس بچھائی، وقت نے آواز دی، شہرِ آہن نے پکارا، لبیک کہتے ہوئے جمشید پور پہنچے۔ بساطِ تدریس آراستہ کی، بہار آ گئی۔ زمینوں کے اثرات انسانی طبیعتوں پر یقیناً مرتب ہوا کرتے ہیں۔ لوگ وہاں سیسہ اور لوہا پگھلایا کرتے تھے، آپ نے سنگ دلوں کو پگھلانا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ وہ زمین اس قابل ہوئی کہ اس پر علم کی کاشت کی جا سکے۔ 1952ء میں ٹاٹا جیسی مضبوط کمپنی اور اس کی فیکٹری کے شہر میں مدرسہ فیض العلوم کے نام سے ایک دینی فیکٹری کی بنیاد رکھ دی، جہاں آہن گری نہیں بلکہ انسان سازی کے اصول سکھائے جانے لگے۔

(3) بہار کی راجدھانی پٹنہ جہاں سے اٹھنے والی ہر آواز باشندگانِ بہار کی تحریک میں مؤثر رول ادا کرتی ہے، اس کے اطراف میں امارتِ شرعیہ جیسے کئی نامور ادارے غیروں نے قائم کر رکھے تھے جن کے ہمہ گیر اثرات نے رفتہ رفتہ پورے بہار کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ علامہ کا دل تڑپ اُٹھا۔ اضطراب انگیز ماحول میں بڑے پیمانے پر 'بہار صوبائی سنی کانفرنس' منعقد کی اور 12 مئی 1967ء کو قلب راجدھانی پٹنہ میں 'ادارہ شرعیہ پٹنہ' کی داغ بیل ڈال دی۔ آج یہ ادارہ پوری قوت کے ساتھ بہار کے سنّی مسلمانوں

کی مذہبی قیادت کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔

(4) قائد اہلِ سنت کی زندگی کا یہ باب کتنا درخشاں اور عبرت آموز ہے، کون نہیں جانتا سہارنپور کو! نہ جانے ہمارے مذہبی قائدین کے کتنے قافلے روز وشب یہاں کے اسٹیشن سے ہوکر گزر جاتے ہیں۔ کسی نے ہمّت نہ کی کہ ذرا ٹھہر کر اس شہر کے سنّی عوام کی حالت زار کا جائزہ لے لیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شہر جو کبھی سنّیت کا مرکز تھا، بدعقیدگی کی سپلائی کا مرکز بن گیا۔ وہ شہر جہاں آج پانچ سو سے زائد اہل اللہ آسودۂ خاک ہیں، جن میں اقطاب بھی ہیں، ابدال بھی، نجبا بھی ہیں اور نقبا بھی، جہاں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمہ کے چار خلفا آرام فرما ہوں، حضرت سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پڑپوتے کی تربت ہو، جس زمین میں 940 سال پہلے کے بزرگ داتا گنج بخش علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے مصاحب آرام فرما ہوں، جس شہر کا پورا نام ہی سلسلۂ چشتیہ کے عظیم بزرگ شیخ ہارون چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر رکھا گیا ہو، آج وہ شہر وہابی فکر کے حامل افراد اور اداروں کی راجدھانی بن چکا ہے۔

ہماری بے توجہی اور خود غرضی کے باعث گزشتہ ایک صدی کے اندر خصوصاً مغربی یوپی پر وہ یلغار کی گئی کہ یہاں کی خوش عقیدہ آبادیاں بدعقیدگی میں تبدیل ہوگئیں۔ نانوتہ ہو یا گنگوہ، تھانہ بھون ہو یا دیوبند، ضلع سہارنپور ہو یا ضلع مظفرنگر کے قصبات و دیہات ان تمام آبادیوں کو عظیم المرتبت اولیائے کرام کا مولد ومسکن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مگر آج ان کے حالات دگرگوں ہیں۔

وہ گنگوہ جسے ہمارے علما کسی اور جہت سے جانتے ہوں گے ذرا اس پہلو سے بھی اس پر غور کر لیتے کہ یہ وہی گنگوہ ہے جہاں چودہ سلاسل کی وراثتوں کے امین، مجدد الف ثانی، شیخ احمد فاروقی سرہندی کے پردادا پیر قطب عالم شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا مرقد مرجع خلائق ہے، جن کی بارگاہ میں تاجدار سلاطین مغل بابر بھی میکشوں کی طرح حاضری دیتا ہوا نظر آتا ہے، جن کی درویشی کا عالم یہ ہے کہ چالیس سال تک ایک ہی قمیص کو زیب تن کیا۔

آج بھی ہماری عظمت رفتہ کی امین یہ خانقاہیں، بزرگوں کے مقدس آستانے ہمیں آواز دے رہے ہیں۔ آؤ اپنی اصل کی طرف آؤ، اپنے ماضی سے رشتہ جوڑو۔ لیکن کون ہے جو ان کی پکار سنے؟ کون ہے جو اُن کا جواب دے؟

کوئی 27 سال پہلے (1984) کی بات ہے۔ جبکہ قائد اہلِ سنت دہلی کی تسخیر کو اپنی زندگی کا آخری عہد و پیمان بنا کر ضامن المسجد (نزد درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء، نئی دہلی-13) کے چھوٹے سے حجرے میں قیام پذیر تھے۔ ایک 50-45 سال کا کیم شیم، خوبرو اور وجیہ شخص حجرہ میں داخل ہوا، خاندانی مجد وشرافت جس کے انگ انگ سے نمایاں تھی، تابندہ جبیں پر تقدس کی لکیریں دیکھ کر دل نے گواہی دی، ضرور یہ کسی قیمتی کان کا ہیرا ہے۔

نو وارد نے کہا: سہانپور سے حکیم محمد احمد قادری حاضر ہوا ہے۔ فوراً اُٹھ کر بغل گیر ہوئے، مزاج پرسی فرمائی۔ باتوں بات میں سہانپور کے حالات سے روشناس کرا دیا۔ سنیوں کی حالت زار کی خبر دے دی۔ قائد اہلِ سنت کا دل تڑپ اُٹھا، وفور کرب سے پلکیں بھیگ گئیں۔ کچھ ہی دنوں بعد سہارنپور کے لیے عازم سفر ہوگئے۔ سہارنپور پہنچے۔ حکیم صاحب جو بڑے باپ کے بڑے بیٹے ہیں، جن کا چشتی شفاخانہ (ضلع سہارنپور) ہندوستان بھر کے مریضوں کے لیے مرکز توجہ ہے، آپ کا شمار ہندوستان کے ان چند نباض طبیبوں میں ہوتا ہے جو مریض سے حال پوچھے بغیر صرف نبض دیکھ کر مریض کے سارے احوال سے باخبر ہو جاتے ہیں۔ بہر حال انھوں نے اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کرتے ہوئے ایک جلسے کا اہتمام کیا۔ قائد اہلِ سنت کی ولولہ انگیز تقریر ہوئی۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد قائد اہلِ سنت نے حکیم صاحب سے فرمایا: یہاں کی فضا بیمار اور ہوا مسموم ہوچکی ہے۔ اس کو صحت مند بنانے کے اہلِ سنت کے ایک مدرسہ کے قیام کی سخت ضرورت ہے۔ آپ جگہ کا انتظام کیجیے۔

قائد اہلِ سنت رقم طراز ہیں:

''میرے اصرار پر انھوں نے وسط شہر چمن آباد میں تین بیگھے کا ایک قطعہ آراضی تلاش کیا جس کی قیمت ایک لاکھ سولہ ہزار تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ اللہ کا نام لے کر بیعانہ کر لیجیے۔ سہارنپور کے مٹھی بھر سنیوں میں اگر اسے خریدنے کی سکت نہیں ہے تو کیا ہوا، خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔ میری گزارش کے مطابق بیعانہ کی رقم ادا کرنے کے بعد رجسٹری کے لیے ایک سال کی مہلت حاصل کر لی گئی۔ مدن پورہ بنارس کے رؤسائے اہلِ سنت کو خدائے کریم دونوں جہاں کی ارجمندیوں سے سرفراز کرے، ہماری تحریک پر انھوں نے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیے، حکیم صاحب کی ہمّت مردانہ اگر سینہ تانے کھڑی نہ ہوتی تو یقین کیجیے کہ ہم اس کامیابی کا منہ ہر گز نہ دیکھ سکتے جواب ہر گوشے سے دیکھنے کے قابل ہے۔'' (ایک سفر دہلی سے سہارنپور تک، علامہ ارشد القادری، ص2، مطبوعہ مکتب جام نور، مٹیا محل، دہلی)

اس طبیب حاذق کے خلوص پر قربان جائیں کہ اس کو وہ یمانی میں تہائی

سے زیادہ زر کثیر کا انتظام انھوں نے خود اپنی جیب خاص سے کیا اور رجسٹری کے کاغذات حضرت کے ہاتھوں میں تھمادی۔

دیارِ غیر میں اتنی بڑی کامیابی مل جانے پر فرطِ مسرت سے حضرت قائد اہلِ سنت کی باچھیں کھل گئیں، سجدۂ شکر ادا کیا اور 23/اپریل کو سہارنپور پہنچ کر 26/اپریل 1987ء کو قلب شہر میں 'جامعہ غوثیہ رضویہ' کے نام سے ایک ادارہ کی بنیاد رکھ دی۔

تین بگہہ قطعہ آراضی (2600 گز مربع زمین) پر تقریباً 32 کمروں، تین کانفرنس ہال اور تین منزلہ پر شکوہ (صابری جامع مسجد) پر مشتمل یہ ادارہ دور سے دیکھنے میں واقعی ایک قلعہ معلوم ہوتا ہے، جس کی فصیلوں پر گنبدِ رضا کی جلوہ طرازیوں نے عمارت کی دلکشی میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس وقت یہ ادارہ حکیم صاحب کی سرپرستی، آپ کے بڑے صاحبزادے حکیم سید طارق انور چشتی کی نظامت اور جوان سال عالم دین مولانا اعجاز احمد ثقافی کی تعلیمی قیادت میں منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس ادارہ کی پوری کفالت حکیم صاحب اپنی جیب خاص سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ شہر کے سارے سنّی خوش عقیدہ مسلمان اس ادارہ سے وابستہ ہیں اور قرب و جوار کے ہزاروں مسلمانانِ اہل سنت حکیم صاحب کے حلقۂ ارادت میں داخل ہیں۔ راقم کو سہارنپور اور گنگوہ کے تعلق سے مذکورہ بالا تفصیلات حکیم صاحب ہی کی زبانی معلوم ہوئیں۔

(5) قائد اہلِ سنت کے طائر بلند پرواز نے کبھی گوہاٹی (آسام) کی فصیلوں پر دستک دی اور ہل سنت کا نشیمن سیچون نام کی ایک پہاڑی میں بنایا اور وہاں آرام فرما ایک مرد درویش کے نام پر دارالعلوم مخدومیہ کی تاسیس کر کے طوفانوں کی زد پہ ایک چراغ روشن کر دیا۔

(6) دی اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

ڈاکٹر اقبال کا یہ شعر زبان زد عام و خاص ہے، اس کو پڑھنے کے بعد ذہن کے پردوں پر آج بھی ہزار بارہ سو سال پہلے کی وہ تصویر اُبھر کر سامنے آجاتی ہے جب مجاہدینِ اسلام کے قافلے ریگزارِ عرب کو عبور کرتے ہوئے صحرائے افریقہ اور وادیِ اسپین میں داخل ہوئے تھے۔ ان کی برکتوں سے وہ کلیسا جن میں تین خداؤں کی پرستش ہوتی تھی توحید کے نغموں سے گونج اٹھے۔ بیسویں صدی عیسوی کے تقریباً ربعِ آخر میں قائم شدہ 'ورلڈ اسلامک مشن (الدعوۃ الاسلامیۃ العالمیۃ) مذکورہ شعر کی ایک عملی تشریح و تصویر ہے جس کی خدمات خصوصیت کے ساتھ انگلینڈ و ہالینڈ کی سرزمین پر اپنی مثال آپ ہیں۔ مبلغ اسلام حضرت مولانا شاہ احمد نورانی فرزند حضرت مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھی و بعض دیگر علمائے اہلِ سنت کے اشتراک و تعاون سے حضرت علامہ ارشد القادری نے اس کی تاسیس سے توسیع تک مرکزی کردار ادا کیا ہے۔

(7) ہالینڈ کا سفر:

1983ء میں کچھ احباب کی دعوت پر قائد اہلِ سنت نے ہالینڈ کا سفر کیا۔ ان کے لیے بہت آسان تھا کہ دو چار تقریریں کر کے اپنے معتقدین کا ایک محفوظ حلقہ بنا کر واپس لوٹ آتے لیکن انھوں نے محسوس کر لیا کہ یورپ میں عیسائی مذہب کا زوال شروع ہو چکا ہے۔ یورپین اقوام کی نئی نسل مذہب سے دُور ہوتی جا رہی ہے۔ ان کے چرچ ویران ہو رہے ہیں۔ مذہبی درسگاہوں میں گرد اُڑ رہی ہے۔ ہر چیز کو عقل کے ترازو پر تولنے والے مذہب کو بھی عقل کے ترازو پر تول رہے ہیں۔ عیسائی مذہب کا یہ عقیدہ ان کے حلق کے نیچے کسی طرح نہیں اُتر رہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سولی پر چڑھ کر سارے انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بن گئے۔

1983ء کے سفر میں حضرت علامہ شاہ احمد نورانی اور ان کے حلقۂ اثر کے تعاون سے جامعہ مدینۃ الاسلام کے نام سے دینی تعلیمات کا ایک مرکز قائم فرمایا۔ اور اس کے لیے تین منزلہ عمارت خرید کر دینی تعلیم کا باضابطہ آغاز کر دیا۔

قائد اہلِ سنت کے لیے یہ چنداں حیرت کی بات نہیں ہے کہ وہ خود ہی اس ادارہ کے مؤسس بھی تھے، منتظم بھی اور مدرس بھی۔ نو مہینے مسلسل ہالینڈ میں رہ کر ڈچ، انگریزی اور فرنچ زبانوں میں تقریریں کرنے والے مبلغین کی ایک ٹیم تیار کر کے وطن واپس لوٹ آئے۔ (فغانِ درویش، اُردو، کانپور، علامہ ارشد القادری، ترتیب خوشتر نورانی)

(8) دوسری بار ہالینڈ کا سفر:

پانچ سال پہلے ہالینڈ میں جو شجر کاری کی گئی تھی اس کا پھل اب پک کر تیار ہو چکا تھا۔ 4/جون 1988ء کی تاریخ جشن دستار بندی کے لیے مقرر ہوئی اور فاؤنڈر چیئرمین ہونے کی حیثیت سے علامہ کو دعوت دی گئی۔ آپ نے اس سفر میں یورپ کو اسلام کی دہلیز پر کھڑا کرنے کے لیے ایک بہت ہی مؤثر اور جامع منصوبہ بنایا۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ یہاں ایسے علما پیدا ہوں جو ان کی مادری زبان میں اسلام کا آفاقی پیغام ان تک پہنچا سکیں۔ اس کا سب سے آسان طریقہ یہ تھا کہ یورپ میں جن مسلمان بچوں کی مادری زبان، انگلش، فرنچ، جرمن اور ڈچ ہے انھیں بچوں کو عالمِ دین بنایا جائے۔ اس

وسیع منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کیتھولک عیسائیوں کی ایک وسیع کالج کی عمارت مل گئی۔ خدا کی غیبی امداد اور اس کے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فیضان پر بھروسہ کر کے داخل ہوئے۔ ان کی برکتوں سے وہ کلیسا جن میں تین خداؤں کی پرستش ہوتی تھی توحید کے نغموں سے گونج اٹھے۔ بیسویں صدی عیسوی کے تقریباً ربع آخر میں قائم شدہ 'ورلڈ اسلامک مشن (الدعوة الاسلامیة العالمیة) مذکورہ شعر کی ایک عملی تشریح وتصویر ہے جس کی خدمات خصوصیت کے ساتھ انگلینڈ و ہالینڈ کی سرزمین پر اپنی مثال آپ ہیں۔ مبلغ اسلام حضرت مولانا شاہ احمد نورانی فرزند حضرت مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھی وبعض دیگر علمائے اہلِ سنت کے اشتراک وتعاون سے حضرت علامہ ارشد القادری نے اس کی تاسیس سے توسیع تک مرکزی کردار ادا کیا ہے۔

(8) سورینام (جنوبی امریکہ) میں اسلامی مرکز کا قیام:

1988ء میں سورینام (جنوبی امریکہ) کی زمین پر قائد اہلِ سنت حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ نے قدم رکھا۔ وہاں کے شوریدہ حال مسلمانوں کا جائزہ لیا۔ بے شمار مشکلات سینہ تانے کھڑی تھیں لیکن ان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سرینام کی راجدھانی 'پاراماری بوٗ میں دارالعلوم علیمیہ کے نام سے ایک تعلیمی مرکز کی بنیاد رکھ دی۔ وہاں مسلمانوں کی کوئی مؤثر سیاسی تنظیم نہیں تھی جو ان کے مسائل کو حکومت تک پہنچائے اس کے پیشِ نظر 'سورینا مسلم پولیٹیکل کونسل' کے نام سے ایک ملک گیر مؤثر تنظیم کی بنیاد ڈالی۔ (فغان درویش علامہ ارشد القادری)

(10) پاکستان کا سفر اور دعوتِ اسلامی کا قیام:

ایک بار کراچی کے کچھ مخلص جذباتی مسلمانوں نے شکایتی لہجہ میں قائد اہلِ سنت سے کہا:

حضور! نام نہاد تبلیغیوں نے پوری دنیا میں اپنے مرکز قائم کر رکھے ہیں، ہمارے پاس کوئی ایسی تنظیم نہیں جو منظم طریقہ پر بھولے بھالے غافل سنیوں کی رہنمائی کا کام انجام دے سکے۔ اور ان کو ان بھیڑیوں کا لقمہ بننے سے بچائے۔ بے نوا سنیوں کے ان سیدھے سادھے جملوں کا اثر قائد اہلِ سنت کے فولادی دل پر ایسا ہوا کہ آپ پر اضطرابی کیفیت طاری ہوگئی۔ عالم کرب میں فرمایا:

مجھے ایک کمرہ میں بند کر دو اب میں ایک تحریک لے کر کمرہ سے باہر نکلوں گا۔ ایسا ہی ہوا۔ پوری یکسوئی اور اطمینان کے ساتھ آپ نے ایک عالمگیر تنظیم کا نقشہ تیار کیا۔ اس کے اصول اور طریقۂ کار وضع کیے۔ اور نام 'دعوت اسلامی' رکھا۔ تحریک کو زندہ رکھنے کے لیے ایک درسی کتاب 'فیضان سنت' کا خاکہ بھی تیار کیا۔ (بروایت مولانا یوسف رضا قادری بھیونڈی، ممبئی) اس سلسلے میں حضرت مولانا شاہ احمد نورانی وحضرت مفتی ظفر علی نعمانی بانی دارالعلوم امجدیہ کراچی وحضرت مفتی وقارالدین رضوی شیخ الحدیث دارالعلوم امجدیہ کراچی سے مختلف مراحل میں تبادلۂ خیال کے بعد دارالعلوم امجدیہ کراچی کے اندر 1982ء میں دعوت اسلامی کی تشکیل ہوئی۔ حضرت مفتی وقارالدین رضوی کی نشاندہی پر مولانا محمد الیاس عطار قادری کو دعوت اسلامی کا امیر بنایا گیا۔ (بروایت علامہ یٰسین اختر مصباحی، بانی وصدر دارالقلم نئی دہلی، 25)

(11) دارارقم مکہ مکرمہ کی سرزمین پر مبلغ اسلام علامہ شاہ احمد نورانی، حضرت علامہ ارشد القادری، علامہ عبدالستار خان نیازی، علامہ شاہ فرید الحق اور پیر معروف نوشاہی کے اشتراک سے 'الدعوة الاسلامیہ العالمیۃ' (ورلڈ اسلامک مشن) کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد رکھی گئی اور 12/دسمبر 1973ء کو اس کا عالمی مرکز برطانیہ کے شہر 'بریڈفورڈ' میں قائم کیا گیا۔

1975ء میں ورلڈ اسلامک مشن کے زیر اہتمام علمائے اہلِ سنت کے ایک مؤقر ونمائندہ وفد نے یورپ، امریکہ اور افریقہ کے مختلف مقامات کا تبلیغی دورہ کیا۔ اس وفد کے نمایاں ارکان مبلغ اسلام حضرت مولانا شاہ احمد نورانی وقائد اہلِ سنت علامہ ارشد القادری تھے۔ □□

بقیہ: —— انٹرویو: ملک غضنفر علی

مسجد کا ایک حصہ ہے اس کے ساتھ سماجی سرگرمیاں اور تعلیمی شعور اُجاگر کرنا بہت ضروری ہے۔ ہم نے مردم شماری کے دوران کمیونٹی کی بہت رہنمائی کی ہے، ہمارا لوکل بینفیٹ آفیسر ہے جو ہر مہینے کی پہلی سوموار مسلمانوں کی مشکلات ومسائل سنتا اور ان کے حل کے لیے مشورے دیتا ہے۔ ہم شادی اور نکاح کے سرٹیفکیٹ دیتے ہیں، ایجوکیشن کانفرنس کر چکے ہیں، ہمارے ہاں بہت سفیر آچکے ہیں۔ لارڈ، ہوم اور فارن منسٹرز آچکے ہیں، یہ سنٹر دینی اور سماجی سرگرمیوں کا گہوارہ ہے۔

س: کمیونٹی کو آگے بڑھنے اور نوجوان نسل کو کیا پیغام دیں گے؟

ج: ہندو پاک مسلم کمیونٹی اور نوجوان نسل کو کہوں گا کہ آپ کی شناخت ہے اسے مت ضائع ہونے دیں، آپ اللہ اور رسول کے ماننے والے ہیں یہ شناخت دنیا اور آخرت میں کام آئے گی، ہر وہ کام کریں جس کی دین اجازت دیتا ہے اور ہر اس کام سے اجتناب کریں جس کی دین اجازت نہیں دیتا۔ □□

قرآن کریم: ایک اجمالی تعارف

پروفیسر نثار احمد فاروقی

قرآن کریم صحفِ سماوی میں سے وہ آخری صحیفہ ہے جو خاتم النّبیین رحمۃ للعالمین حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم (569ء-632ء) پر وحیِ الٰہی کے ذریعے سے نازل ہوا۔

لفظ قرآن عربی زبان میں مصدر بھی ہے جس کے معنی ہیں 'پڑھنا' اس لفظ کی اصل آرامی زبان سے ہے۔ پہلی بار یہ لفظ سورہ مزمل میں آیا (73-4) جو نزولی ترتیب میں تیسری سورۃ ہے۔ لفظ قرآن کتاب اللہ میں 66 بار آیا ہے۔

قرآن کریم کے کچھ نام اور بھی ہیں، مثلاً اَلْفُرْقَان۔ (25-1) اَلْکِتَابُ (2-1) اَلذِّکْر۔ (43-44) وغیرہ۔ ان کے علاوہ 53 نام بطور صفت استعمال ہوئے ہیں۔

بعض علما نے قرآن کریم کے نام 90 سے زیادہ شمار کیے ہیں۔

قرآن کی بنیاد وحیِ الٰہی پر ہے جو ناموسِ اکبر حضرت جبرئیل کے واسطے سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی تھی۔ وحی کیا ہے؟ اور کس طرح نازل ہوتی تھی اس پر علمائے اسلام نے بہت کچھ لکھا ہے۔ (مثلاً شاہ ولی اللہ دہلوی 'حُجَّةَ اللّٰه البَالِغَه' یا ڈاکٹر محمد حمید اللہ 'مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه' باب:10، پیرا:272)

پہلی وحی سورۂ علق کی آیات تھیں۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ. خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ. اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ. الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ. عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ۔ (5-1:96) اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر قمری حساب سے 40 سال 7 ماہ اور شمسی حساب سے 39 سال 3 ماہ 16 دن تھی۔

جبریل امین نے 'اِقْرَاْ'' کہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''مَا اَنَا بِقَارِی '' (بخاری شریف) اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت جبرئیل قرآن کریم کو لوح کی صورت میں لے کر آئے تھے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھنے سے معذرت کی تو انھوں نے لوحِ قرآن کے الفاظ زبانی یاد کرائے یا آپ کا سینۂ مبارک علم لدنی کے لیے کھول دیا تو آپ نے خود وہ الفاظ پڑھ لیے۔ اس روایت سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمی ہونا ثابت ہے۔

پہلی وحی کے نزول سے دنیا کی تاریخ کا ایک نہایت اہم باب کھل گیا اور عالمِ بشریت میں ایک ایسے عظیم الشان انقلاب کا آغاز ہوا جس کا سرسری تعارف بھی کرائیں تو ہزاروں صفحے سیاہ ہو جائیں۔ یہیں سے اسلام کا آغاز ہوتا ہے جس کے اثرات ایک صدی کے اندر دنیا کے تین برِّ اعظموں میں پہنچ گئے۔ یہ پہلی وحی 17/رمضان کو آئی، جو ولادتِ نبوی کا 41 واں سال اور عیسوی 609 تھا۔ پہلی اور دوسری وحی کے درمیان خاصہ فاصلہ رہا جسے بعض علماء نے ڈھائی سال تک کی مدت مانا ہے اور اسے 'فَتَرة' کہا جاتا ہے۔ دوسری وحی تھی: یَاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ (2-1:74) اس کے بعد 12 سال 5 ماہ اور 13 دن تک (یعنی پہلی ربیع الاوّل 54 ولادت نبوی تک) وحی مکہ مکرمہ میں نازل ہوتی رہی۔ وحی عموماً دن میں آتی تھی، چند سورتیں مثلاً الانعام، الفلق، النّاس رات میں نازل ہوئیں۔ علاّمہ سیوطی نے أَلاِتقان میں اُن آیات کا بیان بھی کیا ہے جو موسم گرما میں یا موسم سرما میں نازل ہوئیں۔

اس تاریخ کے بعد 9/ذی الحجہ 63 ولادتِ نبوی تک وحی کا نزول مدینہ منورہ میں ہوا، آخری آیت کون سی نازل ہوئی اس میں روایات کا اختلاف ہے۔ اکثر علما نے کہا ہے کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ (3:5) آخری وحی ہے۔ بعض کا قول ہے کہ سب سے آخر میں سورۂ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ (1:110) نازل ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سورۂ بقرہ کی (آیت 281) وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَی اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَ هُمْ لَایُظْلَمُوْنَ (281:2) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے 7 یا 9 دن قبل نازل ہوئی تھی۔

قرآن کریم کو نزول کے پہلے دن سے ہی حفظ بھی کیا گیا اور لکھا بھی گیا۔ اسے ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَارَیْبَ فِیْهِ۔ (1:1) کہا ہے اور کتاب کے لیے لکھا ہوا ہونا ضروری ہے۔ پھر قرآن میں ہے لَایَمَسُّهٗ' اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (اسے صرف پاک لوگ ہاتھ لگائیں) ظاہر ہے کہ چھونے کے لیے بھی کسی شے پر لکھا ہونا ضروری ہے۔ اس طرح کی اور شہادتیں بھی ہیں، اس لیے یہ گمان کرنا سراسر غلط ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن کریم لکھا ہوا موجود نہیں تھا۔ بخاری کی روایت ہے کہ یکجا اور بَیْنَ الدَّفَتَیْنَ۔ (مجلد) بھی موجود تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال قرآن شریف سنتے بھی تھے اور حیاتِ طیبہ کے آخری رمضان میں دو بار سماعت فرمایا تھا۔ (شاطبی)

نزول کے اعتبار سے قران کریم کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:(1) مکی (2) مدنی۔ مکی قرآن میں 86 سورتیں ہیں جو عموماً مختصر ہیں اور ان کے موضوعات عموماً توحید، آخرت، عبادات، قیامت، بَعَث بعد الموت، ثواب وعقاب، جنت وجہنم وغیرہ ہیں، یا حسنِ معاملہ کے آفاقی اصول اور اقدار کا بیان ہوا ہے۔ ان میں خطاب عموماً یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ کہہ کر کیا گیا ہے۔

مدنی قرآن میں قرآن کریم کا 11/30 حصہ اور 28 سورتیں ہیں جو نسبتاً طویل ہیں اور اُن میں خطاب یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے ہوا ہے، اور احکام شرع بیان ہوئے ہیں۔

35 مکی سورتوں میں بعض آیات مدنی اور 8 مدنی سورتوں میں بعض آیات مکی بھی ہیں۔ کچھ آیات نہ مکہ میں نازل ہوئیں نہ مدینے میں، بلکہ دورانِ سفر میں اُن کا نزول ہوا ہے۔ علما نے سہولت کے لیے قبلِ ہجرت نزول وحی کو مکی اور بعد ہجرت نزولِ وحی کو مدنی مانا ہے۔ سورۂ توبہ کی آیات 107 تا 110 غزوۂ تبوک سے واپسی کے وقت راستے میں نازل ہوئیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی کی پشت پر تشریف فرما تھے۔

قرآن کریم کو سات منزلوں میں تقسیم کیا گیا ہے اس لیے کہ بعض روایات سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات دن میں قرآن کریم ختم کیا۔ ان منازل کو علما ''فَمِی بِشَوْق'' کہتے ہیں۔ یعنی 'ف' سے فاتحہ، 'م' سے مائدہ، 'ی' سے یونس، 'ب' سے بنی اسرائیل، 'ش' سے شعراء، 'و' سے والصّٰفّٰت، 'ق' سے ق۔ پہلے دن 3، دوسرے دن 5، تیسرے دن 7، چوتھے دن 9، پانچویں دن 11، چھٹے دن 13، ساتویں دن 65 سورتیں۔ ایک ماہ میں ختم کرنے کے لیے اس کے 30 پارے بعد میں بنائے گئے ہیں۔

قرآن کریم میں کل 114 سورتیں ہیں۔ شمار آیات میں اختلاف ہے کسی نے وصل کا اعتبار کیا ہے تو 6218 آیات شمار کیں اور اعتبار وصل نہیں کیا تو 6666 آیات شمار کی گئیں۔ کل الفاظ 77437 ہیں اور تعداد حروف 323671 ہے۔ آیات کے مضامین کا شمار اس طرح کیا گیا ہے کہ آیاتِ وعدہ ایک ہزار، آیاتِ وعید ایک ہزار، آیاتِ نہی ایک ہزار، آیاتِ امر ایک ہزار، احکام حلال 250، احکام حرام 250، آیاتِ مثال ایک ہزار، آیاتِ قصص ایک ہزار، آیاتِ تسبیح 100 عدد۔ مضامین کے اعتبار سے بعض سورتیں 'طوال' (یعنی بڑی) کہلاتی ہیں، بعض کو 'المئون' کہتے ہیں جن میں کم وبیش 100 آیات ہیں۔ سورۂ یٰسٓ سے سورۂ قٓ تک 'مثانی' کہلاتی ہیں اس لیے کہ ان میں احکام وامثال کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ چھوٹی سورتیں جو عموماً نماز میں پڑھی جاتی ہیں 'المفصّل' کہلاتی ہیں۔

قرآن کریم کی 29 سورتوں میں 14 حروفِ مقطعات آئے ہیں جیسے کٓھٰیٰعٓصٓ، الٓرٰ وغیرہ۔ 15 آیات وہ ہیں جن میں سجدہ واجب ہے۔ فقہا نے آیات قرآنی کو ناسخ ومنسوخ اور محکمات ومتشابہات میں بھی تقسیم کیا ہے۔

قرآن کریم کی کتابت کا طریقہ مخصوص اور منفرد ہے، اور اُسی رسم خط میں لکھا جانا چاہیے۔ مثلاً الکِتٰب، الظّٰلِمِیْن وغیرہ۔ اسی طرح تجوید، ترتیل اور قرأت بھی باضابطہ فن ہے۔ ان ضوابط کے ساتھ قرآن کریم پڑھنے والے کو 'قاری'، 'مقری' یا 'مجوِّد' کہتے ہیں۔ جسے پورا قرآن کریم یاد ہو اُسے 'حافظ' کہا جاتا ہے۔ قرآن کے مطالب کی تشریح کرنے والے کو مفسر اور اس سے جزا وسزا یا حلال وحرام کے احکام نکالنے والے کو فقیہ کہتے ہیں۔

قرآن کریم کی سات قرأتیں ہیں جنھیں 'سبعۃ احرف'' کہا جاتا ہے۔ سبعۃ احرف سے کیا مراد ہے اس بارے میں مختلف اقوال ہیں، مگر یہ ساتوں قرأتیں درست ہیں، مثلاً: مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ اور مَلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ یا لَایَذُوْقُوْنَ فِیْھَا الْمَوْتَ اور لَایَذُوْقُوْنَ فِیْھَا طُعْمَ الْمَوْتِ۔

ہمارے درمیان آج دنیا بھر میں جو قرأت رائج ہے وہ حفص بن سلیمان کوفی (709-796) سے منسوب ہے۔

قرآن کریم کی حفاظت کا اللّٰہ نے وعدہ کیا ہے :

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ''اور دنیا کی ہر کتاب سے زیادہ اس کی حفاظت ہوئی ہے۔'' کروڑوں کی تعداد میں لکھا گیا ہے اور کروڑوں کی تعداد میں چھاپا گیا ہے، دنیا کی ہر حصے میں اسے زبانی یاد رکھنے والے کروڑوں حفاظ گزرے ہیں اور آج بھی موجود ہیں۔ دنیا بھر کی مسجد میں دن میں پانچ بار نماز میں اس کی تلاوت ہوتی ہے۔ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ قرآن کریم کو دیکھ کر پڑھنا (ناظرہ) زیادہ ثواب کا موجب ہے۔

(سیوطی: الاتقان 1/108)

قرآن کریم کی حفاظت اور کتابت روزِ اوّل سے شروع ہوگئی تھی، قرآن کا لکھا جانا اندرونی شہادتوں سے بھی ثابت ہے، اسے 'الکتاب' کہا گیا۔ جو چیز لکھی ہوئی نہ ہو اُسے کتاب نہیں کہہ سکتے۔ سورۃ نمبر 52 میں ہے: وَالطُّوْرِ وَکِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ۔ اس سے بھی باریک جھلی پر لکھنا ثابت ہے۔ قرآن حفظ کرنے کی سند میں یہ آیت پیش کی جاسکتی ہے بَلْ ھُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ۔ (سورہ عنکوت، آیت: 49)

متعدد اصحابِ رسول آیاتِ قرآنی کو کھجور کی چھال پر، ہڈیوں پر، تختیوں پر لکھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (وفات 32ھ) نے 70 سورتیں لکھ کر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی تھیں۔ (ابن سعد 2/342) اسی طرح

حضرت زید بن ثابت نے بھی اپنا لکھا ہوا قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تھا۔ حضرت زید نے جنگ قادسیہ میں شہادت پائی (16ھ) حضرت مجمع بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے دو تین سورتوں کے سوا سارا قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں لکھ لیا تھا۔ (ابن سعد 2/355-372)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ اوّل حضرتِ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (وفات 634ء-13ھ) نے پھر خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (وفات: 644ء-23ھ) نے جمع و ترتیب کا اہتمام جاری رکھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مصحف اُن کی وفات کے بعد آپ کی دُختر اُمّ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہ کی تحویل میں رہا۔

خلیفۂ ثالث حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ (شہادت ذی الحجہ 35ھ- جون 656ء) کا زمانہ آیا تو انھوں نے ایک بورڈ مقرر فرمایا جس کے ارکان یہ تھے: حضرت زید بن ثابت (وفات: 45ھ) حضرتِ عبداللہ بن الزبیر، حضرت سعید بن العاص، حضرت عبدالرحمٰن بن الحارث بن ہشام رضی اللہ عنہم۔

ہر آیت کے لیے دو گواہیاں لی جاتی تھیں۔ سورۂ احزاب اور سورۂ توبہ کی آخری آیات صرف حضرت ابوخریمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ (وفات: 37ھ) کے پاس لکھی ہوئی تھیں۔ (حدیث صحیح عن انس رضی اللہ عنہ) اور انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اور موقع پر ''ذوالشہادتین'' (یعنی دو شہادتوں والا) فرمایا تھا۔ (ابن سعد 4/378) اس لیے صرف انھیں کی گواہی پر اسے قبول کر کے سورۂ توبہ کو سورۃ الانفال کے آخر میں شامل کیا گیا، اس لیے کہ سورۂ توبہ کا مضمون اُس سے ملتا جلتا تھا۔ صرف یہی سورۃ ایسی ہے جس کے آغاز میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نہیں ہے۔ بعض راویوں کا بیان ہے کہ ہر سورت کے ساتھ بِسْمِ اللّٰهِ بھی نازل ہوئی تھی اس کے ساتھ نہیں ہوئی۔ (الاتقان ص 65) علاّمہ سیوطی کا بیان ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جامع قرآن نہیں ہیں بلکہ انھوں نے اُمت کو ایک رسم الخط اور ایک قرأت پر جمع کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی میں وحی کی کتابت 40 اصحاب نے مختلف اوقات میں کی ہے۔ ممتاز کاتبوں میں حضرتِ عثمان بن عفان، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت زید بن ثابت، حضرت خالد بن الولید، حضرت عبداللہ بن رواحہ، اور حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم اجمعین شامل ہیں۔ عہد خلافت عثمان تک قرآن تو بہت لکھے جا چکے تھے، مگر کسی میں پوری 114 سورتیں نہیں تھیں۔

کاتبین وحی کے مکرم ہونے کی شہادت خود قرآن نے دی ہے: كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَه‘ فِىْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ بِاَيْدِىْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ. (سورۃ: 80، آیت: 11-16)

''خبردار! یہ نصیحت ہے۔ جو چاہے اسے یاد کرے۔ یہ قابلِ احترام صحیفوں میں ہے، جو بلند اور پاک ہیں، نیک اور پاک لوگوں کے ہاتھ سے لکھا ہوا۔''

الطبری کا بیان ہے (جلد: 3/173) کہ دس اصحابِ رسول وہ تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے قرآن کریم لکھا کرتے تھے۔ عہدِ خلافتِ راشدہ میں قرآن شریف کی خرید و فروخت بھی شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ کسی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں فتویٰ طلب کیا تو انھوں نے فرمایا: لَابَاسَ بِهٖ (اس میں کچھ حرج نہیں) ابن حزم کا بیان ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت عالمِ اسلام میں ایک لاکھ نسخے قرآن کریم کے موجود تھے۔

ذوالحجہ 11ھ میں جنگ یمامہ ہوئی تو 700 حفاظ شہید ہو گئے جو بنوحنیفہ سے لڑ رہے تھے۔ حضرت عمر بن الخطاب کو اندیشہ ہوا کہ اسی طرح جنگ میں حفاظ شہید ہوتے رہے تو قرآن کا کچھ حصہ ضائع نہ ہو جائے۔ انھوں نے حضرت ابوبکر کو جمع قرآن کا مشورہ دیا۔

ابتدا میں حضرت ابوبکر رضی اللہ کو تامل ہوا، مگر آخر شرح صدر ہو گیا اور انھوں نے قرآن جمع کرنا شروع کر دیا۔ اپنے عہد خلافت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعلان کر دیا کہ جس کے پاس قرآن کا جو بھی حصہ ہو، وہ ایوانِ خلافت میں پہنچا دے۔ اس طرح سارا قرآن جمع ہو گیا۔ اس کی ترتیب وہی ہے جس کی ہدایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی۔ ابنِ سعد (2/357) کا بیان ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق کے عہد خلافت میں قرآن جمع کر لیا تھا۔

قرآن کریم کی قرأت میں جہاں اختلاف پایا گیا وہاں یہ طے ہوا کہ محاورۂ قریش کو ترجیح دی جائے، اس لیے کہ قرآن اُن ہی کی لغت میں نازل ہوا ہے۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے عہد میں اسلام جزیرہ نمائے عرب سے نکل کر عجمی علاقوں میں پہنچ چکا تھا اور اہل عجم سے اعراب کی غلطیاں بہت ہوتی تھیں جو کبھی قرآن کا مفہوم اتنا بدل دیتی ہیں کہ معاملہ کفر اور انکار تک پہنچ جاتا ہے۔ مثلاً آیت: اِنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُه‘ کو اگر کوئی اس طرح پڑھے: اِنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلِهٖ تو یہ بڑی بھیانک غلطی ہو گی۔ لہجے کے اختلاف اور مخارج کی کمزوری کے باعث عجمی مسلمان قرآن کو غلط پڑھنے لگے تھے، اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک ایسا متن تیار کر کے تمام عالم اسلام میں شائع کرنا ضروری سمجھا جو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں لکھا جا چکا ہو اور جس میں غلطی کا امکان نہ ہو۔ انھوں نے سارے مصاحف جمع کیے، بورڈ نے سب کا جائزہ لے کر ایک متفق علیہ متن تیار کیا جسے 'مصحفِ امام' کہا جاتا ہے، اس کی سات نقلیں تیار کر کے تمام صوبائی مرکزوں کو بھیج دی گئیں۔ یہ نقلیں کوفہ، بصرہ، دمشق، مکہ، یمن اور بحرین کو روانہ کی گئیں۔

قرآن کریم کی ان کاپیوں میں سے ایک فضل اللہ العمری رحمۃ اللہ علیہ نے دمشق کی جامع مسجد میں دیکھی تھی۔ (مسالک الابصار جلد اوّل صفحہ 195) مشہور سیاح ابن بطوطہ (وفات: 1368ء) نے بھی غالباً یہی نسخہ دمشق میں دیکھا۔ وہ ایک نسخہ کا کوفہ میں دیکھنا بھی بیان کرتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ دمشق والا نسخہ تیمور کے حملے میں جل کر خاکستر ہو گیا تھا مگر تیمور نے بصرہ والا نسخہ حاصل کر لیا تھا اور غالباً یہی وہ نسخہ ہے جو بعد کو حضرت عبید اللہ احرار کے خاندان میں رہا۔ اس کا 1869ء تک تاشقند (روس) کے مدرسہ دیوان بیگی میں موجود ہونا ثابت ہے۔ خاص مواقع پر اس نسخۂ قرآن کی زیارت عوام کو کرائی جاتی تھی اور لوگ دُور دُور سے اس متبرک مصحف کو دیکھنے آیا کرتے تھے۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے جو شہادت کے وقت (9/جون 656ء) حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تلاوت فرما رہے تھے اور اُس کی آیت فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (سورۃ:2، آیت:137) پر ان کے خون کے چھینٹے پڑے تھے۔ یہ نسخہ خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے ہاتھ سے کتابت کیا تھا۔ یہ نسخہ ہرن کی جھلی پر لکھا ہوا اور قدیم خطِ کوفی میں تھا۔ آج کل یہ تاشقند کے میوزیم آف ہسٹری کی زینت ہے۔

قرآن کریم کی کتابت پہلے خطِ قیرموز میں تھی پھر خطِ حیری ہوئی، عہدِ عثمانی میں اور بقول بعض 60ھ سے خطِ کوفی میں لکھا گیا اور عہد عباسی میں ابنِ مقلہ نے خطِ نسخ ایجاد کیا جو آج تک رائج ہے۔

قرآن کریم کی کتابت میں پہلے نقطے اور رموز و اوقاف نہیں تھے۔ آیت کا نشان تین نقطوں (∴) سے دیا جاتا تھا۔ ابوالاسود الدولی نے حضرت علی ابن ابی طالب کے حکم سے قواعدِ نحو کو ضبط کیا۔ انھوں نے ہی آیت کے لیے O گول دائرہ تجویز کیا۔

دوسرے رموزِ اوقاف محمد بن طیفور السجاوندی (وفات: 1164ء) نے وضع کیے جن کا جاننا صحیح قرأت کے لیے بہت ضروری ہے۔

مطبوعہ قرآن کریم میں حاشیہ پر 'ع' کا نشان ہوتا ہے اُس میں ایک ہندسہ اوپر ہوتا ہے جو سورۃ کا رکوع نمبر ہے، دوسرا ہندسہ 'ع' کے پیٹ میں ہوتا ہے یہ اُس رکوع کی آیت کا نمبر ہے، تیسرا ہندسہ 'ع' کے نیچے ہوتا ہے۔ یہ پارے کا رکوع نمبر ہے۔

علامتوں میں 'م' لازم کا مخفف ہے۔ یہاں ٹھہرنا لازم ہے، ورنہ مفہوم بدل جائے گا۔

ط: مطلق کا مخفف ہے، (وقفِ مطلق) یعنی بات پوری ہو گئی۔

ج: جائز کا مخفف ہے یعنی یہاں وقفہ جائز ہے، نہ کرے تو حرج نہیں۔

ز: مجوز کا مخفف ہے۔ ٹھہرنے اور نہ ٹھہرنے دونوں حالتوں کا جواز ہے، مگر ٹھہرنا اچھا ہے۔

ص: مرخص کی تخفیف ہے یعنی یہاں ٹھہر جائے تو اعادہ کرنا اچھا ہے۔

ق: کا مطلب ہے قِیْلَ عَلَیْهِ الْوَقْفِ یعنی بعض قرأنے یہاں وقفہ بتایا ہے۔

قف: کا مطلب ہے یُوْقَفُ عَلَیْهِ یعنی یہاں ٹھہرا جاتا ہے، نہ رُکے تو حرج نہیں۔

س: کے معنی ہیں ایسا سکتہ کہ سانس نہ ٹوٹے۔

وقفہ: یہاں سکتہ سے زیادہ ٹھہرنا ہوتا ہے۔

صل: کا مطلب ہے قدیوصل۔ یعنی اس آیت کو اگلی آیت سے ملایا جاتا ہے نہ ملائے تو مضائقہ نہیں۔

صلے: کے معنی ہیں اَلْوَصْلُ اولٰی یعنی ملائیں تو اچھا ہے۔

مع: کا مطلب ہے معانقہ، اس کی جگہ آیت کے اوّل و آخر میں صرف تین نقطے بھی لکھ دیتے ہیں (کہ اس لفظ معانقہ میں تین نقطے ہیں) مراد یہ ہے کہ شروع میں وصل کر کے آخر میں وقفہ کریں یا آخر میں ملا کر پڑھیں۔

لا: کا مطلب ہے لا وقف علیه یہاں ٹھہرنا نہیں، ٹھہریں تو اعادہ کریں۔ آیت کی علامت O پر لا لکھا ہو تو اعادہ ضروری نہیں۔

ہ: آیت کی علامت ہے اس پر جو حرف لکھا ہو، اس کے مطابق پڑھا جائے گا۔

خالد بن ابی الہیاج رحمۃ اللہ علیہ کو قرآن کریم کا پہلا خطاط سمجھا جاتا ہے۔ یہ ولید بن عبدالملک کے دربار میں تھے اور ولید کے حکم سے انھوں نے پہلی بار مسجد نبوی کی محرابوں پر سورۂ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا آبِ زر سے لکھی تھی۔ پھر ان سے حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک خوش خط نسخہ قرآن کریم کا لکھوایا تھا۔ عباسی دور کے وہ خطاط جو قرآن کریم لکھتے تھے ان کے نام ابن الندیم نے اپنی کتاب الفہرست میں دیے ہیں۔

پچھلے چودہ سو برسوں میں لاکھوں بلکہ کروڑوں کاتبوں نے قران کریم کے نسخے لکھے ہیں جن میں سے بعض بادشاہوں کے لیے لکھے گئے، اس وقت

بھی ہزاروں روپے کی لاگت سے ایک نسخہ تیار ہوتا تھا۔

جرمن مستشرقین نے میونخ یونیورسٹی میں ایک انسٹی ٹیوٹ آف قرآ نک اسٹڈیز قائم کیا تھا اور ساری دنیا سے، ہر زمانے میں ہاتھ سے لکھے ہوئے 42 ہزار قلمی نسخے قرآن کریم کے اس ادارے میں جمع کیے تھے۔ یہودی اور عیسائی اسکالر 50 سال تک ان نسخوں کا نہایت دیدہ ریزی سے مقابلہ کرتے رہے، آخر یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے کہ کوئی قابلِ ذکر اختلاف نہیں پایا گیا۔ دوسری جنگِ عظیم میں اس انسٹی ٹیوٹ پر ایک بم (امریکہ نے) گرایا اور سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔ (محمد رسول اللہ، مؤلف محمد حمید اللہ)

یورپ میں قرآن کریم اسپین کی راہ سے پہنچا تھا اور یورپی زبان میں پہلا ترجمہ رابرٹ کینٹ (Robert Kennett) نے 1143ء میں کیا تھا۔ پھر 1543ء، 1594ء، 1598ء، 1613ء، 1694ء میں بھی ترجمے ہوئے، بعد کو بھی متعدد مستشرقین نے تراجم کیے۔ ان کی مفصل فہرست استانبول (ترکی) سے چھپ گئی ہے۔ عربی خط میں پہلا مطبوعہ قرآن 1701ء کا ہے جو ہامبرگ (Hamburg) (جرمنی) میں چھپا تھا۔ بعض علما کا قول ہے کہ پہلا مطبوعہ قرآن بندقیہ (اٹلی) کا ہے جو 1516ء میں چھاپا گیا تھا۔

انگریزی میں قرآن کریم کے جو تراجم مشہور ہیں ان میں جارج سیل کا ترجمہ (1734ء) زیادہ رائج رہا، مگر یہ متعصب عیسائی ہے۔ ہمارے قریبی زمانے میں (1955ء) اے. جے. آربری نے قرآن کا ترجمہ کیا، مگر کہیں کہیں وہ ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ انگریزی کے مستند تراجم میں عبداللہ یوسف علی (اشاعت 1935ء) کے ترجمے قابلِ اعتماد ہیں۔

ہندوستان میں قرآن کریم کا پہلا ترجمہ سندھی یا کشمیری زبان میں ایک ہندو راجا مہروک بن رائک کے حکم سے ہوا تھا، اس نے 883ء میں منصورہ (سندھ) کے گورنر عبداللہ بن عمر کو خط لکھا کہ کسی ایسے شخص کو بھیجیں جو (مقامی) ہندستانی زبان میں قرآن کا ترجمہ کر سکے۔ گورنر نے ایک عالم کو مامور کیا جو اس راجا کے دربار میں تین برس تک رہا اور اس نے ابتدا میں سورۂ یٰسین تک 36 سورتوں کا ترجمہ کیا، یہ پتہ نہیں چلتا کہ ترجمہ کس زبان میں کیا تھا یہ اطلاع ایرانی سیّاح بزرگ بن شہریار نے اپنی کتاب عجائب الہند (طبع لندن ص3) میں دی ہے۔ ہندوستان میں علم تفسیر پر زبردست کام ہوا، جس کی تفصیل کے لیے بروکلمان کی تاریخ ادبیات عربی، فواد سزگین کی تاریخ التراثِ الاسلامی، مولانا عبدالحی الحسنی کی الثقافۃ الاسلامیہ فی الھند، ڈاکٹر زبید احمد کی ادبیات عربی میں پاک و ہند کا حصہ اور غلام احمد حریری کی تاریخ تفسیر و مفسرین دیکھی جا سکتی ہیں۔

ہندوستان کے قدیم مفسروں میں مولانا شہاب الدین دولت آبادی (وفات 849ھ/ 1431ء)، شیخ علی بن احمد المہائمی (وفات: 835ھ/ 1431ء)، حضرت سیّد محمد حسینی گیسودراز (وفات: 825ھ/ 1422ء)، شیخ مبارک ناگوری (وفات: 1593ء)، فیضی فیاضی، شیخ نظام الدین تھانیسری (وفات: 1036ھ/ 1626ء)، شاہ ولی اللہ دہلوی (وفات: 1176ھ/ 1762ء)، شاہ عبدالقادر دہلوی (وفات: 1814ء) شاہ رفیع الدین (وفات: 1233ھ/ 1818ء) شاہ عبدالعزیز (وفات: 1239ء/ 1823ء مولانا احمد علی مفسر لاہوری (وفات: 1962ء)، مولانا اشرف علی تھانوی (وفات: 1942ء)، حکیم محمد حسن امروہوی (وفات: 1405ء)، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی (وفات: 1920ء) مولانا فتح محمد جالندھری، سرسیّد احمد خاں (1898ء)، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (1979ء)، مولانا احمد رضا خاں بریلوی (وفات: 1340ھ/ 1920ء)، مولانا ابوالکلام آزاد (وفات: 1957ء) مولانا ثناء اللہ امرتسری، خواجہ حسن نظامی دہلوی (وفات: 1955ء) مولانا عبدالماجد دریا آبادی وغیرہ سینکڑوں علما کے نام آتے ہیں۔ اب تک اُردو میں 95 مکمل تراجم شمار کیے جا چکے ہیں۔

ہندوستان کی دوسری علاقائی زبانوں میں بھی قرآن کریم کے ترجمے ہوئے ہیں، قوسین کا عدد تعدادِ تراجم ظاہر کرتا ہے۔ ان میں تیلگو (9)، ملیالم (8)، مرہٹی (7)، کنڑ (6)، گجراتی (5)، بنگالی (4)، پنجابی (3)، کشمیری (2)، آسامی (1) اور ہندی (2) کے تراجم ہیں۔ ہندی میں ایک منظوم ترجمہ سردار جے. پی. سنگھ کا ہے۔ اُردو نظم میں ترجمہ سیماب اکبر آبادی نے کیا تھا جو وحی منظوم کے نام سے چھپا۔

ایک منظوم اُردو ترجمہ آغا شاعر قزلباش دہلوی نے بھی کیا تھا، ان کے علاوہ کیف بھوپالی اور کبیر کوثر بھوپالی کے منظوم اُردو تراجم بھی ہیں۔ (کلکتہ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ڈاکٹر سمیع اللہ اسد نے بھی قرآن شریف کا ایک منظوم اُردو ترجمہ کیا ہے جو ابھی زیرِ تکمیل ہے۔)

یہ ایک بہت ہی مختصر سا جائزہ قرآن کریم کے نزول، جمع و ترتیب اور حفظ و اشاعت کی تاریخ کا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مسلمانوں کے تمام علوم کا محور ہے، دنیا میں جو کچھ بھی علم پھیلا ہے اس کی تاریخ کو ٹٹولیے اور گہرائی سے تجزیہ کیجیے تو ان سب کا محرک اور سببِ اصلی قرآن کریم ہی ہے۔ □□

(یہ مضمون جلسے میں پڑھنے کے لیے لکھا گیا اور اختصار مدِّ نظر تھا اس لیے بعض باتیں صرف اشارتاً ہی آ سکی ہیں، ورنہ ہر بات کی تفسیر تاریخ القرآن کی کتابوں میں موجود ہے۔ ن-ا-ف)

(بہ شکریہ ماہنامہ 'تصوفِ ملّی' اگست 2005)

تاریخ

مغل سلطنت مختلف تناظر میں

نوشاد عالم چشتی

مغل سلطنت کی بنیاد کن عناصر پہ قائم تھی اور بابر نے سلطنتِ مغلیہ کے قیام کے وقت برصغیر میں کس طرح کا خواب دیکھا تھا یہ تاریخ وسطیٰ ہند کا ایک دلچسپ موضوع ہے۔ اس مضمون میں مغل سلطنت کو مختلف تناظر میں دیکھنے کی ایک مختصر کوشش کی گئی ہے۔

ڈاکٹر ستیش چندرا اپنی کتاب 'مغل دربار کی گروہ بندیاں اور اُن کی سیاست' میں مغل امرا کے متعلق رقم طراز ہیں:

''شاہانِ مغلیہ نے امرائے حکومت کی جو تنظیم قائم تھی وہ بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ امورِ انتظامیہ کی صحیح طور پر انجام دہی، سماجی اقدار کی استواری، حکومت کی فوجی اور سیاسی ذمہ داریوں کا سرانجام اور حقیقت میں خود حکومت کے استحکام اور تنظیم کا انحصار امرا کی تنظیم کی کارفرمائی پر منحصر تھا۔''

مغل حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر امرا کی اجارہ داری تھی۔ انھیں بادشاہ کی تائید اور سرپرستی حاصل تھی، سماج میں ان کی توقیر وعزت تھی۔ لوگ ان کے دبدبے سے خائف رہتے تھے۔ زیادہ تر امرا عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ اپنی زندگی میں بھی ساری دولت عیش پرستی میں لٹا دینا چاہتے تھے کیوں کہ ان کے فوتگی کے بعد ان کی ساری دولت وملکیت اور جائداد حکومت وقت ضبط کرلیتی تھی۔ ان کا خاندان بہت وسیع ہوتا تھا۔ وہ بہت قیمتی غیر ملکی اشیا کے استعمال کے عادی تھے۔ شراب نوشی ان کے گھروں میں عام تھی۔ بعض مورخین کے نزدیک ان کی عورتیں بھی شراب پیتی تھیں۔ اکثر امرا شراب نوشی کی کثرت سے فوت ہوتے تھے۔ یہ لعنت مغل بادشاہوں اور شہزادوں میں بھی تھی۔ امرا بادشاہوں کی پیروی میں اپنے حرم میں ناچنے والی لڑکیوں کو رکھا کرتے تھے۔ شاہ خرچی کا مظاہرہ کرنے کے لیے مختلف تقریبات کا انعقاد کرتے تھے اور ان میں مرغن غذاؤں کا استعمال بکثرت ہوتا تھا۔ عام طور پر امرا بدعنوانیوں میں ملوث رہا کرتے تھے۔ وہ رشوت لینے اور دینے میں کوئی شرم، عار اور جھجک محسوس نہیں کرتے تھے، مگر ان ذاتی کمزوریوں کے باوجود امرا اپنی کارکردگی کے اعتبار سے ایک نادرونایاب ادارہ تھے۔

مغل دور میں ہر لیاقت مند شخص امرا کی صف میں شامل ہوسکتا تھا۔ مغلوں نے افغانی، تورانی اور ایرانیوں کے علاوہ مقامی ایک مسلمان اور ایک ہندو کو بھی امرا کے زمرے میں شامل کرنا شروع کیا۔ ایک اہلکار بھی ایمانداری، محنت اور قابلیت کی بنا پر ترقی کرکے وزیر کے عہدہ پر فائز ہوسکتا تھا۔ سلاطینِ دہلی کے امرا کے برعکس مغل دور کے امرا سازشی کم اور وفادار زیادہ تھے۔ بابر اور ہمایوں کا زمانہ عجلت، انفرادی جنگ، گہری اور ابتدائی استحکام کا دور تھا۔ اس لیے امرا کی ہیئتِ ترکیبی پر کچھ خاص توجہ تغیر وتبدل کی بنا پر نہیں دی گئی۔ مگر اکبر نے اس جانب خصوصی توجہ دی۔ اعلیٰ نسل کے راجپوت امرا کو انتظامِ حکومت میں شامل وداخل کیا اور انھوں نے بھی وفاداری کے ساتھ شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ مختلف علاقوں اور قوموں کے لوگ جب طبقہ امرا میں شامل ہوئے تو سیاسی، سماجی اور قومی یکجہتی کا فروغ ہوا اور اس اندازِ سلطنت نے گنگا جمنی تہذیب کے ارتقا میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ میل محبت اور مذہبی رواداری کے فروغ نے مغل سلطنت کو ہندوستان میں استحکام بخشا۔

مغل دور کے امرا کی ایک خصوصیت سلطنت دہلی کے امرا کے مقابلے میں یہ بھی ہے کہ مغل امرا نے ہند کی سیاسی وحدت کو مقدم رکھا اور مغل بادشاہوں نے بھی امرا کے اندر سلطنت سے وفاداری کے جذبے کو فروغ دیا۔ انھیں سماج میں ایک اعلیٰ مقام اور ثقافتی شناخت عطا کی۔ انھیں باصلاحیت بنایا اور نظم ونسق میں صدق دلی سے کام کرنے کا خوگر بنایا۔ ان امرا کی لیاقت، بہادری اور جذبۂ وفاداری کی وجہ سے مغل سلطنت ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصے تک ہندوستان پر خوشحالی اور اتحاد واستحکام کے ساتھ حکومت قائم کی۔

عہد مغلیہ کے زرعی نظام:

قدیم زمانے ہی سے ہندوستان ایک زرعی ملک رہا ہے۔ عوام کی اکثریت کا پیشہ زراعت وزمینداری رہا ہے۔ مسلمانوں کی آمد کے بعد اس نظام میں مختلف اعتبار سے تبدیلی ہوتی رہی۔ شیر شاہ سوری نے اپنی حکومت کے دوران آراضی کی ملک گیر پیمانے پر پیمائش کرائی اور کسانوں کو قبولیت نامہ دیا گیا اور ان پر ٹیکس مختص کیا گیا۔ اسے 'رعیت داری نظام' کے نام سے مورخین منسوب کرتے ہیں۔ اس نظام سے کسانوں کو درمیانی آدمی کے چنگل سے نجات دلوائی گئی۔ اس سے کسان خود اعتمادی کے ساتھ کام کرنے لگے۔ ابتدائی مغل دور میں شہنشاہ بابر اور ہمایوں کو ملکی سیاسی حالات کے پیش نظر زرعی اصلاحات کرنے کا وقت نہیں ملا، لیکن شہنشاہ اکبر اعظم نے اپنے دور میں محکمہ مال گزاری میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی شروعات کی۔ انہی

آراضی اصلاحات کو بعد کے مغل حکمرانوں نے خفیف تغیر وتبدل کے ساتھ اپنے اپنے دور میں جاری رکھا۔

مغل بادشاہ اکبر اعظم نے 1575ء میں عام قدیم جاگیروں کو منسوخ کردیا۔ تمام سلطنت کو 182 پرگنوں میں تقسیم کیا گیا۔ ہر ایک پرگنہ پر ایک کروڑی کا تقرر کیا گیا جو مال گزاری کے وصولنے کا فریضہ انجام دیا کرتا تھا۔ بعد میں یہ افسران بدعنوانیوں میں ملوث ہونے لگے۔ اکبر نے 1582ء میں راجہ ٹوڈرمل کو دیوان اشرف بنایا۔ انھوں نے پورے مال گزاری کے نظام میں تبدیلیاں لائیں۔ 1570ء سے 1580ء تک یعنی دس سال کی مال گزاری کا اوسط نکالا گیا اور اس کے ایک تہائی حصہ کو بحیثیت ٹیکس متعین کیا گیا۔ آلہ پیائش میں تبدیلی کر کے بجائے رسّی کے بانس کو روشناس کرایا۔ اسے لوہے کے گھنگھروں سے باندھ دیا جاتا تھا۔

اراضیات کو پیداوار کے اعتبار سے چار قسموں میں تقسیم کیا گیا: (1) پولج، (2) پاروتی، (3) چھاچھر (4) بنجر۔ پولج زمین کی باقاعدگی کے ساتھ کاشت کی جاتی تھی، اس میں ہر سال فصلیں ہوتی تھیں اور ہر سال ٹیکس ادا کیا جاتا تھا۔ پاروتی زمین پر بعض مرتبہ کاشت نہیں کی جاتی تھی، لیکن وقفہ کے بعد کاشت کرنے پر اس میں فصلیں اچھی ہوتی تھیں۔ چھاچھر زمین تین یا چار سال تک ناقابلِ کاشت رکھی جاتی اور بنجر زمین تو پانچ یا اس سے زائد برسوں تک ناقابلِ کاشت ہوتی۔

کاشت کے اعتبار سے پولج اور پاروتی زمینوں کو تین درجوں میں تقسیم کیا گیا۔ اچھی، اوسط، خراب۔ ان تینوں فصلوں کا اوسط نکال کر اسے ٹیکس کا اساس بنایا گیا۔ پیداوار کے 1/3 حصہ کو مملکت کا ٹیکس قرار دیا گیا۔ خراب موسموں پر مال گزاری معاف کردی جاتی تھی۔ کسانوں کی ساری اراضیات کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ ٹیکس وصول کنندہ ماہانہ آمدنی کا گوشوارہ شاہی خزانے کو روانہ کرتے تھے۔ کسانوں کو رضامندی کے ساتھ ٹیکس ادا کرنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ طاقت کا استعمال بحالت مجبوری کیا جاتا تھا۔

متذکرہ نظام کو ضبطی نظام کہا جاتا تھا۔ یہ نظام الٰہ آباد، بہار، لاہور، دہلی، ملتان، آگرہ، اودھ، مالوہ اور گجرات کے کچھ حصوں میں رائج تھا۔ اس کے علاوہ ایک نظام جسے گلا بخشا نظام کہتے تھے، کابل، یہ نظام کشمیر اور سندھ کے ٹھٹھ میں مروّج تھا۔

اکبر اعظم کا نظام محکمہ مال گزاری نہایت منظم اور کامیاب تھا۔ اس سے کسانوں کی فلاح و بہبود کے مواقع بڑھے، ٹیکس متعین ہونے کی وجہ سے سرکاری عہدہ داروں کی بدعنوانیوں میں بہت حد تک کمی آئی۔ کسانوں کو اپنی ملکیت کی سلامتی مل گئی۔ زندگی کی تمام ضروری اشیا سستی ہوگئیں۔ عوام الناس اور کسان و کاشت کار بہت آسودہ زندگی گزارنے لگے۔

مغل دور میں ادب و فنونِ لطائف:

مغل دور ادب، آرٹ اور فنونِ لطیفہ کے فروغ و ارتقا کا سنہرا دور رہا ہے۔ تقریباً تمام بادشاہوں نے وقت اور حالات کی گنجائش کے تحت اپنے اپنے دور میں ہر ممکن ادب و آرٹ کی سرپرستی کی ہے۔ مغل سلطنت کا بانی شہنشاہ ظہیر الدین محمد بابر خود ایک عظیم اسکالر تھا۔ عربی، ترکی، فارسی سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ ادب شناس تھا، دیگر ادیبوں اور شاعروں کی بلند پایہ تخلیقات کو پسند کرتا تھا۔ وہ خود بھی ایک اچھا مصنف تھا۔ اس کی خود نوشت سوانح حیات 'تزکِ بابر' یا 'بابر نامہ' فصاحت و بلاغت کی روشن دلیل ہے۔ وہ مافی الضمیر ادا کرنے پر کما حقہٗ قادر تھا۔ خطیب بھی بلند پایہ کا تھا۔ وہ علما، فضلا اور مشائخ کی صحبت سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ ہمایوں کا دور اگر چہ استحکام کے لحاظ سے پر خطر تھا مگر اس کے دربار میں بھی شعرا، دانشور، مذہبی عالموں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ وہ کتابوں کا عاشق تھا۔ دورانِ سفر بھی کتابوں کی لائبریری ساتھ رکھتا تھا۔ 'تذکرۃ الواقعات' کا مصنف اس کا خادم تھا۔

اکبر اعظم اگرچہ حالات و زمانہ کی رعایت سے ٹھوس بنیاد پر تعلیم حاصل نہیں کرسکا، مگر اس نے مطالعۂ فطرت غائر کیا اور اس میں یکتائے روزگار رہا۔ اکبر کا دور ادبی سرگرمیوں کے عروج و ارتقا کا سب سے قیمتی دور تصور کیا جاتا ہے۔ اس دور میں ادبی اور تاریخی تصنیفات کثیر تعداد میں منظرِ عام پر آئیں جس میں تراجم بھی شامل ہیں۔ تاریخ الفی، اکبر نامہ، آئینِ اکبری، معاصر راحمی، طبقاتِ اکبری، منتخب التواریخ اور والمیکی کی رامائن، مہابھارت، اتھرو وید اور لیلاوتی کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔

جہانگیر اپنے دادا اور پردادا کی طرح خود ایک اچھا اسکالر تھا۔ اس کی ایک تصنیف 'تزکِ جہانگیری' ادبی اہمیت کی حامل ہے۔ اس نے اپنی خودنوشت میں راست بازی، ایمانداری اور معروضیت کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اس دور میں معاصر جہانگیری، اقبال نامہ اور جہانگیری جیسی کتابیں لکھی گئیں۔ اس عہد کے ادیب و قلمکاروں میں مرزا غیاث بیگ، نقیب خاں، معتمد خاں، نظامت اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی جیسے اساطینِ فن تھے، جہانگیر نے درباری شاعر طالب کی شاعری کا خود انتخاب پیش کیا، اس سے اس کی شاعرانہ دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔

شاہجہاں کے دور میں پادشاہ نامہ، اعمالِ صالح اور شاہ جہاں نما جیسی بلند پایہ کتابیں تصنیف ہوئیں۔ عبدالحمید لاہوری، عنایت خاں، محمد صالح

جیسے باکمال ادیبوں کی سرپرستی کی گئی۔

کاش کہ داراشکوہ وقت کے بے رحم ہاتھوں کا شکار نہ ہوتا تو تصنیف و تالیف اور تراجم کی دُنیا میں ایک ادبی انقلاب سے زمانہ روشناس ہوتا۔ پھر بھی سکینۃ الاولیا، سفینۃ الاولیا، اپنشدوں اور گیتا کا سنسکرت سے فارسی میں کیے گئے تراجم اس کے ادبی کارناموں کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

مغل سلطنت کے زوال کے اہم ستون اورنگ زیب کی سرپرستی میں فتوحاتِ عالم گیری، عالم گیر نامہ، معاصر عالم گیری، رقعات عالم گیری، فتاویٰ عالمگیری اور خان کی منتخب اللباب وغیرہ شامل ہیں۔

مغل دور کے آخری شہنشاہ بہادر شاہ ظفر ایک بلند پایہ شاعر اور ادب پرور تھے۔ مغل شاہی خواتین میں ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ، شاہجہاں کی ایک صاحبزادی جہاں آرا بیگم کی تصنیفات اور اورنگ زیب کی بیٹی زیب النسا کا دیوان بھی ادبی سرگرمیوں اور اس کی سرپرستی کا ایک خاص حصہ ہے۔

مغل دور میں ہندی اور سنسکرت ادب کے فروغ پر بھی توجہ دی گئی۔ مرزا عبدالرحیم خانخاناں اور بھگوان داس نے ہندی میں شاعری کی۔ بیربل کو اکبر نے کوی راج کا خطاب دیا۔ عہد اکبر میں تلسی داس نے اودھی میں رام چرت مانس کو لکھا۔ سورداس کی شاعری کا زمانہ بھی عہد اکبری ہے، اس کی شاعری میں کرشن بھکتی پر زور دیا گیا ہے۔ جگن ناتھ پنڈت جو سنسکرت کا شاعر تھا اسے شاہجہاں نے کوی راج کا خطاب دیا۔ اس نے گنگا لہری لکھی، مغلوں کے دور میں ادب کی خاص سرپرستی کی گئی۔ عربی، فارسی کے علاوہ مقامی زبان اور ہندوستان کی سنسکرت زبان پر بھی بطور خاص توجہ دی گئی اور مختلف زبانوں کی شاعری اور ادب کو پھلنے پھولنے کا برابر موقع دیا گیا۔

مغل عہد کی صنعتیں:

مغل حکمرانوں نے ملک کے سیاسی استحکام کے علاوہ معاشی استحکام کے لیے بھی اپنی کوششیں جاری رکھیں تا کہ عوام ایک خوشحال زندگی بسر کرسکیں۔ مغلوں کے زمانے میں کئی شہروں کو عروج حاصل ہوا۔ گجرات، بنگال اور دکن میں بندرگاہیں تھیں۔ تجارت کی غرض سے یورپی ممالک سے تاجر ہندوستان آیا کرتے تھے، اس سے صنعتی ترقی کا پتہ چلتا ہے۔ بنگال، گجرات، پنجاب میں شکر کی صنعت ترقی یافتہ تھی۔ تیل اور افیون کی صنعت بھی اچھی تھی۔ یہ اشیا دوسرے ممالک کو برآمد کی جاتی تھیں۔ مٹی کے کھلونے اور ظروف سازی کے لیے دہلی، بنارس اور چونار مشہور تھے۔ کشمیر اور کرناٹک میں لکڑی کا کام کیا جاتا تھا۔ باربرداری کے لیے کشتیاں بنائی جاتی تھیں۔ لوہے سے تلوار، خنجر اور دوسرے روایتی ہتھیار بنائے جاتے تھے، لیکن توپ نہیں بنائی جاتی تھی۔ پنجاب اور گجرات اس کے لیے مشہور تھے۔ جست کی صنعت کے لیے بنارس مشہور تھا۔ سونے، چاندی اور ہاتھی دانت سے زیورات بنائے جاتے تھے۔ سونا پنجاب کی دریاؤں کے کناروں سے حاصل کیا جاتا تھا۔ ہیرے چھوٹا ناگپور اور گولکنڈہ سے دستیاب ہوتے تھے۔ کوہِ نور ہیرا گولکنڈہ میں ہی پایا گیا۔ ملک میں چمڑے کی صنعت ترقی یافتہ تھی۔ نمک سمندری پانی سے بنایا جاتا تھا۔ جنوبی ہند کی بندرگاہوں میں موتیوں کی صنعت ترقی یافتہ تھی۔ فتح پور سیکری میں گلاس بنانے کے کارخانے تھے۔ جونپور اور گجرات عطریات کے لیے مشہور تھے۔

قلعے، مساجد اور مقابر کی تعمیر کی بنا پر پتھر کاٹنے والے اور عمارت بنانے والوں کی ایک کثیر تعداد ملک میں موجود تھی۔ ہندوستان کی سب سے بڑی صنعت کپڑے تیار کرنے کی تھی۔ ملک میں کپاس، ریشم اور اون کے کارخانے تھے۔ اکبر نے لاہور میں اونی ملبوسات کی تیاری کے لیے ایک بڑا کارخانہ لگوایا۔ اس قسم کے کارخانے جہانگیر نے امرتسر میں قائم کیے۔ بنگال، بنارس، آگرہ، لاہور، دہلی، ملتان، ٹھٹھ، احمد نگر، پٹن، بڑودا، سورت، برہانپور، خاندیش، مالوہ وغیرہ میں سوتی کپڑے تیار کیے جاتے تھے۔ مغلیہ دور میں تجارت کو فروغ حاصل ہوا۔ پیشے موروثی تھے، ملکی صنعتوں سے زرِمبادلہ حاصل ہوتی تھی، ہندوستانی سوتی صنعت کو فرانس، پرتگال اور برطانیہ نے تباہ و برباد کیا۔

مغلوں کا فنِ تعمیر:

مغل حکمراں عظیم معمار تھے۔ ان کا جمالیاتی ذوق بہت بلند تھا۔ ان کی بنوائی ہوئی حسین و جمیل عمارتیں آج بھی ان کے آرٹ اور فن تعمیر کے نادر و نایاب نمونے ہیں۔ ابتدائی مغل دور کی تعمیرات میں ایرانی و ترکی فن تعمیر کے اثرات پائے جاتے ہیں، لیکن بعد میں مقامی اثرات نمایاں ہونے لگے۔ اسے ہند-ایرانی فن تعمیر سے موسوم کیا جاتا ہے۔

بابر کی ہندوستانی عمارتوں سے متعلق رائے اچھی نہیں تھی۔ بابر نے عمارتیں تعمیر کرائیں، آگرہ، فتح پور سیکری، بیانہ، دھولپور، گوالیار اور کوئل میں سینکڑوں مزدوروں کو تعمیرات میں لگایا۔ اس کی تعمیر کردہ عمارتوں میں کابل باغ، پانی پت کی ایک مسجد اور سنبھل کی جامع مسجد موجود ہیں۔

ہمایوں نے فتح آباد ضلع حصار کے مقام پر ایک مسجد تعمیر کی۔ دہلی میں اپنا محل بنایا مگر عجلت میں بنا ہوا لگتا ہے۔ اکبر اعظم کو فن تعمیر سے خصوصی لگاؤ تھا۔ اس دور میں تعمیری کام بڑے پیمانے پر انجام دیئے گئے۔ اکبر کے دور

میں ہند-ایران طرزِ تعمیر کا چلن شروع ہوا۔ حضرت شیخ سلیم چشتی کے اعزاز میں بسایا ہوا فتح پور سیکری جو اکبر کا پہلا دارالخلافہ بھی ہے، اس میں بارہ سال تک تعمیرات کا سلسلہ جاری رہا۔ جامع مسجد، بلند دروازہ، بیربل کی رہائش، شہزادی امبر اور ترکی کی سلطانہ کا محل اور دیوان خاص قابلِ ذکر ہیں۔ آگرہ اور لاہور کے قلعوں کی تعمیر میں مغلیہ فنِ تعمیر اپنے جمالیاتی عروج کے ساتھ جوبنوں پر ہے۔ گوالیار، آگرہ اور لاہور کے قلعے ہندوستانی تعمیراتی آرٹ کے بہترین نمونے ہیں۔ اکبر کا سکندر کا مقبرہ بھی لائق توجہ ہے۔

جہانگیر کے عہد میں اعتمادالدولہ کا مقبرہ سنگِ مرمر سے بنایا گیا۔ یہ خوبصورتی کا دلکش اور نادر نمونہ ہے۔ نور جہاں نے لاہور کے قریب شہادرا کے مقام پر جہانگیر کا مقبرہ تعمیر کیا۔ سکھوں نے جہانگیر، آصف خاں اور نور جہاں کے مقبروں کو بری طرح نقصان پہنچایا ہے۔ شاہجہاں کو تو عمارتوں کی تعمیر کا بہت شوق تھا۔ اس دور کی عمارتوں میں جوہری اور مصوری کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ شاہجہاں کی اہم عمارتوں میں دہلی کا دیوانِ عام، دیوانِ خاص، جامع مسجد، موتی مسجد اور آگرہ کا تاج محل ایک عظیم شہکار ہے۔ بڑی صاحبزادی جہاں آرا بیگم نے آگرہ قلعہ کے سامنے ایک بڑی جامع مسجد کی تعمیر کی ہے۔ یہ ایک نہایت خوبصورت اور شاندار مسجد ہے۔ اورنگ زیب کو فنونِ لطیفہ میں کم دلچسپی تھی، اس نے 1674ء میں لاہور میں بادشاہی مسجد تعمیر کرائی۔ اورنگ زیب کے عہد میں ہی مغلیہ فنِ تعمیر مائل بہ زوال ہو گیا تھا۔

مغل دور میں مصوّری:

مغل بادشاہوں نے فنِ مصوری کو فروغ دیا۔ اس فن کی دل کھول کر پذیرائی اور سرپرستی کی۔ بابر اور ہمایوں نے مصوری سے دلچسپی کا اظہار کیا۔ ہمایوں کی ایما پر مشہور زمانہ مصور بہزاد کے دو شاگرد عبدالصمد اور میر سید براستہ کابل سے ہندوستان آئے۔ اکبر نے اپنے دربار میں مصوروں کی سرپرستی کی اور فنِ مصوری کے فروغ کے لیے الگ سے ایک شعبہ قائم کیا۔ عبدالصمد نے اس کے حکم سے کتابوں کے علاوہ دیواروں پر بھی تصویریں بنائیں۔ جہانگیر کے دور میں مغل مصوری بامِ عروج پر تھی۔ جہانگیر اس فن میں یکتائے زمانہ تھا۔ اس نے اکبر کے زمانے کی تصویروں کو مکمل کروایا۔ جہانگیر نے ابوالحسن کو 'نادرِ زماں' اور منصور کو 'نادرِ عصر' کا خطاب دیا۔ ان کے علاوہ اس کے دربار میں آغا رضا، محمد نادر، محمد مراد، بھیشم داس، منوہر مادھو، تلسی داس اور گوردھن جیسے مصور موجود تھے۔

عہد شاہجہانی میں دیگر مصوری کے علاوہ پنسل سے بنائی جانے والی تصویروں کو فروغ حاصل ہوا۔ اورنگ زیب نے اسلام اور شریعت کی وجہ سے مصوری کی شاہی سرپرستی ختم کر دی۔ ان کے خیال کے مطابق مصوری کی اسلام میں جگہ نہیں تھی مگر اپنے بھائیوں کو قتل کیا اور باپ کو قید میں رکھا، شاید اسلام میں اس کی جگہ تھی۔

عہد مغلیہ میں موسیقی:

مغل شہنشاہوں کو دیگر فنونِ لطیفہ کے جیسے موسیقی سے بھی بہت لگاؤ تھا۔ انھوں نے دیگر فنکاروں کی طرح دربارِ شاہی میں موسیقاروں کی بھی سرپرستی کی۔ بابر شاعری کے علاوہ موسیقی کا دلدادہ تھا۔ ہمایوں موسیقاروں اور گلوکاروں کا پرستار تھا۔ اس نے پیر اور بدھ کو محفل سرود کے لیے مختص کر دیا تھا۔ اکبر بھی موسیقی کا دلدادہ تھا۔ اس کے دربار میں ہندو، کشمیری، تورانی اور ایرانی موسیقاروں کے علاوہ خواتین بھی شامل تھیں۔ درباری موسیقاروں کو سات درجوں میں بانٹا گیا تھا۔ ہر موسیقار کا ایک دن مخصوص تھا۔ اکبر موسیقی پر کافی دسترس رکھتا تھا۔ دربارِ اکبری کا بہترین موسیقار تان سین تھا جو گوالیار کا رہنے والا تھا۔ اس کے بعد بابا رام داس کا مقام تھا۔ اپنے پیش روؤں کی طرح جہانگیر بھی موسیقی سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ محمد صالح اور اس کے بھائی اچھے گلوکار تھے۔ جگن ناتھ، بیکانیر کا جنار دھن، بھٹ عہدِ جہانگیر کے عمدہ موسیقار تھے، جنھوں نے گیری گائیکی کے لیے کئی نغموں کی تخلیق کی۔ شاہجہاں شام میں موسیقاروں سے نغمے سماعت کرتا تھا۔ روزانہ دیوان خانے میں سازوں پر موسیقی کے پروگرام ہوتے تھے۔ شاہجہاں بڑی پرکشش آواز کا مالک تھا۔ اس کی آواز پر بہت سے صوفیا پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اورنگ زیب نے حکومت کے ابتدائی دس برس تک موسیقی کی سرپرستی کی، لیکن بعد میں وہ کسی وجہ سے اس کا مخالف ہو گیا اور دربار سے موسیقاروں کو نکال دیا۔ پابندی کے باوجود امرا اور دیگر شاہی خاندان کے افراد موسیقی کا لطف اُٹھاتے رہے۔ عہد اورنگ زیب میں موسیقی پر پابندی لگنے کے باوجود اس عہد کے مختلف سلاسل کے صوفیا نے اپنی خانقاہوں میں موسیقی اور موسیقاروں کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔ اس میں ایک نمایاں نام حضرت شیخ حسن رسولنما علیہ الرحمہ کا ہے، جن کا مزارِ پاک نئی دہلی ریلوے اسٹیشن سے پہاڑ گنج کی جانب نبی کریم کے علاقے میں لب سڑک ہے۔ آپ کے عرس کے دن ہندوستان کے تمام موسیقار مزارِ پاک پر حاضری دینے کے لیے بمع خاندان حاضر ہوتے ہیں اور آپ کے احسان کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی نسلوں میں یہ روایت منتقل کرتے چلے آ رہے ہیں کہ حضرت نے ہم فنکاروں کے فن کو بچالیا۔ □□

سبق آموز

اسلامی تاریخ کے جھروکوں سے

عمران حمید اشرفی

ادب و احترام کا تقاضہ:

عبدالکریم محمد سمعانی اپنی کتاب 'الانساب' میں حضرت امام احمد بن حنبل کی ایک علمی نشست کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ: حضرت امام احمد ابن حنبل بیماری کی حالت میں تھے اور اسی عالم میں ایک علمی مجلس میں تشریف فرما تھے۔ بوجہ ضعف آپ نے دیوار سے ٹیک لگایا ہوا تھا۔ دورانِ درس حضرت ابراہیم بن طہمان کا ذکر آ گیا۔ یکایک آپ دوزانو ہوگئے۔ دیوار سے ٹیک ہٹالیا، پھر فرمایا: ''صالحین اور نیک لوگوں کے تذکرے کے وقت ٹیک لگا کر بیٹھنا مناسب نہیں۔''

جاؤ، راہِ خدا میں تمھیں آزاد کیا:

حضرت امام زین العابدین کا غلام آپ کے سر پر پانی ڈال رہا تھا، جس برتن سے وہ غلام آپ پر پانی ڈال رہا تھا، اچانک اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر امام زین العابدین پر گر پڑا، اور آپ معمولی زخمی ہوگئے۔ آپ نے غصے سے اپنا سر اُٹھایا اور غلام کی جانب دیکھا۔ غلام نے یہ دیکھا تو قرآن کی یہ آیت پڑھی: ''اور غصے کو پی جانے والے۔'' حضرت امام زین العابدین نے فرمایا: ''میں نے غصہ پی لیا۔'' غلام نے کہا: ''اور لوگوں کو معاف کردینے والے۔'' آپ نے فرمایا: ''میں نے تجھے معاف کیا۔'' غلام نے فوراً کہا: ''اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔'' آپ نے فرمایا: ''جاؤ میں نے تمھیں آزاد کیا۔'' (عیون الاخبار، علامہ دینوری)

اللہ نے رزق ایسا آسان کیا جو گمان میں بھی نہ تھا:

حافظ طاہر مقدسی فرماتے ہیں: ''میں ایک مقام پر ابومحمد بن حداد اور اُن کے ساتھیوں کے پاس ایک مدت تک رہا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ میرے پاس ایک درہم کے علاوہ کچھ بھی نہ بچا اور مجھے کھانے اور لکھنے کے لیے کاغذ دونوں کی ضرورت بیک وقت پڑ گئی۔ دونوں چیزیں ایک ہی وقت میں خریدی نہیں جاسکتی تھیں۔ میں پریشان ہوگیا کہ کون سی چیز زیادہ ضروری ہے اور کیا خریدنا چاہیے؟ اسی حال میں تین دن گزر گئے اور دونوں میں سے ایک بھی چیز نہ خرید سکا۔ فاقے میں تین دن گزر گئے۔ چوتھے دن میں نے اپنے جی میں کہا: اب اگر میں کاغذ خرید بھی لوں تب بھی بھوک کی وجہ سے لکھنا مشکل ہوجائے گا۔ میں نے درہم اپنے منہ میں رکھا اور روٹی خریدنے کے لیے بازار کی طرف چل پڑا، مگر مقدر سے وہ درہم اندر پیٹ میں چلا گیا۔ اپنے آپ پر ہنسی آئی۔ راستے میں مجھے اپنا ایک پرانا دوست ملا۔ اُس نے مجھے ہنستے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ کہنے لگا: کس بات پر ہنسی آ رہی ہے؟ میں نے کہا: کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اصرار کرنے لگا اور قسم دے کر کہنے لگا کہ میں ضرور اسے اصل حقیقت سے آگاہ کروں گا۔ میں نے اُس کے کافی اصرار پر ساری بات بتادی۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ پرتکلف کھانے کھلائے۔ نمازِ ظہر کی ادائیگی کے لیے جب ہم نکلے تو وہاں کے گورنر کا وکیل راستے میں ہمارے ساتھ شامل ہوگیا۔ اُس نے میرے دوست سے میرے بارے میں پوچھا۔ دوست نے کہا: جن کا تم پوچھ رہے ہو، وہ یہ ہیں۔ یہ کہہ کر اُس نے میری طرف اشارہ کردیا۔ کہنے لگا: گورنر نے مجھے تقریباً ایک ماہ سے حکم دیا ہوا ہے کہ میں روزانہ آپ کو دس درہم پہنچاؤں، مگر میں بھول گیا اور آپ کو پہچان نہ سکا۔ ایک مہینے کے تین سو درہم لے کر میں آپ ہی کی تلاش میں نکلا ہوں۔ اچھا ہوا کہ آپ مجھے مل گئے، یہ لے لیجیے۔ یہ کہہ کر اس نے وہ تین سو درہم کی تھیلی میرے حوالے کردی۔ حافظ مقدسی فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ بڑی خیر اور بھلائی کا معاملہ کیا اور اتنا رزق دیا جس کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ پھر صرف اتنی بات نہیں کہ تین سو درہم پر بات ختم کردی، بلکہ آئندہ بلاناغہ مجھے دس درہم پہنچتے رہے، جب تک میں وہاں رہا۔ یہاں تک کہ میں شام چلا آیا۔ یہ ہے اللہ کے اس فرمان کی حقیقت، جس میں فرمایا گیا: اور اللہ اسے وہاں سے رزق عطا فرمائے گا جہاں اسے گمان بھی نہ ہوگا۔

قبر کی ہولناکی:

چوتھی صدی ہجری کے مشہور ادیب اور عالم دین علامہ بدیع الزماں کی موت کا حال احمد بن محمد بن ابوبکر خلکان اپنی کتاب 'وفیات الاعیان' میں تحریر فرماتے ہیں: علامہ بدیع الزماں شدید بیمار ہوئے اور اس بیماری کے دوران آپ پر سکتہ طاری ہوگیا۔ اعزہ واقربا نے جب دیکھا تو وہ یہ سمجھے کہ آپ وفات پا گئے ہیں، لہٰذا ان کی تجہیز وتکفین کردی گئی۔ تدفین کے فوراً بعد آپ ہوش میں آ گئے اور زور سے چیخے۔ شرکائے جنازہ قبر کی جانب آواز سن کر لپکے اور قبر کو دوبارہ کھولا۔ لواحقین نے منظر دیکھا کہ آپ اپنی داڑھی پکڑے ہوئے ہیں اور قبر کی ہولناکی کی وجہ سے انتقال فرما چکے ہیں۔

سات سو کے بجائے سات ہزار درھم دیے :

ایک مرتبہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن مبارک کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: سات سو درہم کا مقروض ہوں، مجھے اس قرض سے نجات دلائیے۔ انھوں نے اسی وقت اپنے منشی کو لکھا کہ اس شخص کو سات ہزار درہم دے دیے جائیں۔ یہ خط لے کر منشی کے پاس پہنچا۔ اس نے پوچھا تم پر کتنا قرض ہے اور تم نے کتنی رقم ابن مبارک سے طلب کی تھی۔ اس نے کہا کہ سات سو درہم۔ منشی نے سمجھا کہ ابن مبارک سے بھول ہوگئی ہے اور وہ سات سو کے بجائے سات ہزار لکھ گئے ہیں۔ چنانچہ اس نے ابن مبارک کو لکھ بھیجا کہ یہ شخص تو صرف سات سو درہم کا مقروض ہے اور آپ نے سات ہزار دینے کا حکم دیا ہے، کہیں بھول تو نہیں ہوگئی؟ ابن مبارک نے جواب میں لکھا کہ جس وقت میرا یہ خط تمھیں ملے اسی وقت اس شخص کو چودہ ہزار درہم دے دو۔ منشی اور بھی حیران ہوا، اس نے از راہِ ہمدردی انھیں دوبارہ لکھا کہ آپ اس طرح اپنا سرمایہ بے دریغ لٹاتے رہے تو یہ بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ خط پڑھ کر عبداللہ بن مبارک شدید برہم ہوئے اور اسے سخت الفاظ میں لکھا کہ میں نے جو حکم دیا ہے، اس پر عمل کرو، ورنہ میری جگہ پر آ بیٹھو، تم جو حکم دو گے، میں اس پر عمل کروں گا۔ میرے نزدیک دنیوی دولت سے زیادہ قیمتی سرمایہ ثوابِ آخرت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ مبارک ہے کہ: جو شخص اپنے کسی مسلمان بھائی کو غیر متوقع طور پر خوش کر دے گا اللہ اس کی مغفرت فرمائے گا۔ میں نے دانستہ سات سو کے بجائے سات ہزار درہم لکھے تھے تاکہ یہ شخص اتنی خطیر رقم اچانک پا کر خوش ہو جائے۔ دوسری مرتبہ میں نے اپنے خط میں چودہ ہزار بھی سوچ کر لکھے، وہ اس کے لیے کہ سات ہزار کی بھنک اس شخص کے کان میں پڑ چکی تھی، چودہ ہزار اس لیے کہ یقیناً غیر متوقع ہوں گے اور یوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اجرِ آخرت کا حقدار ٹھہروں گا۔

لوگوں سے درگزر کرنے والے :

امام اصمعی کہتے ہیں: ''حارث بن مسکین خلیفہ مامون کے دربار میں حاضر ہوئے۔ خلیفہ نے اُن سے کوئی مسئلہ دریافت کیا، جس پر انھوں نے کہا: میں وہی جواب دوں گا جو آپ کے والد خلیفہ ہارون رشید کو امام مالک بن انس نے دیا تھا۔ پھر انھوں نے امام مالک کا قول ذکر کیا جو خلیفہ کو پسند نہیں آیا۔ مامون نے کہا: تو بھی اور مالک دونوں ہی بدبخت! حارث بن مسکین نے کہا: ''سننے والا ان دونوں سے زیادہ بدبخت۔'' یہ جواب سنتے ہی خلیفہ کا چہرہ بگڑ گیا۔ حارث نے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر وہاں سے اُٹھ کر چلنے میں عافیت جانی، چنانچہ وہ وہاں سے چل پڑے۔ ابھی وہ اپنے گھر پہنچے بھی نہیں تھے کہ خلیفہ کا قاصد اُن کے پاس پہنچا اور دربار میں پیش ہونے کا حکم جاری کر دیا۔ قاصد کے اُڑے چہرے کو دیکھ کر اُن کا دل بھی اُڑنے لگا اور انھیں یقین ہوگیا کہ اب کی بار کی پیشی ان کے حق میں نہیں ہوگی، اس لیے وہ کفن والا لباس پہن کر حاضرِ خدمت ہوئے۔ خلیفہ نے انھیں اپنے قریب بلایا اور ان کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ''اللہ تعالیٰ نے جب آپ سے بہتر انسان کو مجھ سے بھی زیادہ برے انسان کے پاس بھیجا تو انھیں حکم دیا تھا کہ نرمی سے بات کرنا، چنانچہ حضرت موسیٰ کو جب فرعون کے پاس دعوتِ دین کے سلسلے میں بھیجا گیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ سے فرمایا تھا: ''فرعون سے نرمی سے بات کرنا، شاید کہ وہ سنور جائے یا ڈر جائے۔'' حارث نے کہا: ''امیر المومنین! میں اپنے جرم کا اعتراف آپ سے معذرت اور اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی معافی چاہتا ہوں۔'' خلیفہ نے کہا: ''اللہ تعالیٰ آپ سے درگزر فرمائے۔ آپ پر کوئی ملامت نہیں اور آپ آزاد ہیں۔''

چاند سے زیادہ خوبصورت:

عیسیٰ بن موسیٰ اپنی اہلیہ سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ ایک دن اُس نے جذبات کی رو میں بہہ کر اپنی بیوی سے یہ کہہ دیا: ''اگر تو چاند سے زیادہ حسین نہ ہوئی تو تجھے طلاق!'' وہ فوراً وہاں سے اُٹھی اور یہ کہہ کر اُس سے پردہ کرلیا کہ ''بلاشبہ تو نے مجھے طلاق دے دی۔'' صبح سویرے وہ خلیفہ منصور کے پاس حاضر ہوا اور اُسے پورا واقعہ بتایا، منصور کے سامنے بے پناہ بے چینی کا مظاہرہ کیا تو منصور نے فقہا اور علما کو اپنے دربار میں بلایا اور اُن سے فتویٰ طلب کیا۔ تمام علما اور فقہا نے متفقہ طور پر فتویٰ دیا کہ بلاشبہ اسے طلاق ہوگئی۔ وہاں امام ابوحنیفہ کے اصحاب میں سے ایک بزرگ بھی موجود تھے۔ وہ بالکل خموشی اختیار کیے ہوئے تھے۔ منصور نے اُن سے کہا: ''آپ بھی تو اس مسئلے کی بابت کچھ فرمائیں؟'' انھوں نے سورۃ 'والتین' کی تلاوت شروع کر دی، جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''بالتحقیق ہم نے انسان کو انتہائی خوبصورت سانچے میں ڈھال کر پیدا کیا ہے۔'' اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کوئی بھی چیز انسان سے زیادہ خوبصورت نہیں ہوسکتی۔ خلیفہ نے عیسیٰ سے کہا: ''اللہ تعالیٰ نے معاملہ آسان فرما دیا، وگرنہ فتویٰ تو جاری ہو چکا تھا۔ جاؤ اُٹھو! اور اپنی بیوی کے پاس جاؤ! اُدھر اُس کی بیوی کو حکم بھیجا ''اپنے خاوند کی اطاعت کرو اس لیے کہ طلاق نہیں ہوئی۔'' ❑❑

برصغیر میں صوفیہ کرام کا منہج دعوت

محمد اکرام ساجد

شفقت و ترحم:

صوفیہ کرام میں دوسروں کے ساتھ شفقت وترحم کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے، خاص طور پر تبلیغی مہمات کے دوران ان کا یہ جذبہ عروج پر ہوتا ہے۔

خواجہ اللہ بخش تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کا اخلاق نہایت اعلیٰ تھا۔ خواہ دشمن ہو یا دوست، جو بھی ان سے ملتا، ان کے اخلاق کا گہرا نقش دل پر لے کر اٹھتا۔ آپ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے، غریبوں اور بے کسوں کی طرف خصوصیت سے توجہ فرماتے۔ ہندو کثیر تعداد میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور آپ کے اخلاق سے متاثر ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتے۔ ایسا ہی ایک ہندو آپ کی صحبت سے اس قدر متاثر ہوا کہ مسلمان ہو گیا اور آپ کی خدمت کرنے لگا۔ آپ نے اس کا نام غلام رسول رکھا۔ اس کے متعلق مصنف 'خاتم سلیمانی' کا بیان ہے کہ وہ زہد واتقا میں صوفیہ کرامِ وقت سے سبقت لے گیا۔ مسلمان ہونے کے بعد خواجہ صاحب نے اس کو اسلامی تعلیم دی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے تفسیر، حدیث اور فقہ میں مہارت پیدا کر لی۔ حج بیت اللہ کے لیے گیا، واپسی پر درس و دریس کا سلسلہ شروع کر دیا اور خواجہ صاحب کی خانقاہ میں بیٹھ کر دیگر اعلیٰ مریدین وخلفا کی طرح درس میں مشغول رہنے لگا۔ (تاریخ مشائخ چشت، ص22-721)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنے والد گرامی شاہ عبدالرحیم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آپ فرماتے تھے کہ ایک روز احباب کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور مجلس میں سکوت تھا۔ اس جگہ مجھے ایک شخص کی صورت دکھائی گئی کہ یہ شخص تمھارے ہاتھ پر رفض سے توبہ کرے گا۔ میں نے یہ واقعہ دوستوں کے سامنے بیان کیا۔ اس واقعہ کے بیس سال بعد میں محمد فاضل کے گھر گیا ہوا تھا۔ وہاں ایک مہمان بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا اور بڑی مہربانی سے پیش آیا۔ دوستوں نے تعجب کیا کہ ایک اجنبی شخص کے ساتھ جو رفض اور فساد عقیدہ کے ساتھ متہم ہے، اس قدر مہربانی کی کیا وجہ ہے؟ میں نے کہا: تمھیں وہ واقعہ یاد نہیں؟ تمام نے سوچا تو اسے پہچان لیا۔ تھوڑے دن گزرے تھے کہ اس نے توبہ کی۔ اس کے بعد بعض لوگوں کی مجلس کی وجہ سے اسے شک پیدا ہوا تو اسے دردِ شکم میں مبتلا کر دیا گیا اور اس کے ذہن میں یہ بات ڈال دی گئی کہ اگر سچی خالص توبہ نہیں کرو گے تو ہلاک ہو جاؤ گے۔ وہ خالص سنی ہو گیا اور رفض اور رافضیت سے مکمل طور پر بیزار ہو گیا۔ مجھ سے اس نے بیعت کی۔ پہلے مجھ سے اس نے پوچھا کہ کون سا طریقہ اختیار کروں؟ میں نے کہا: تمھارے لیے سلسلۂ قادریہ بہتر ہے کیونکہ رافضی حضرت غوث الاعظم کو بہت دشمن سمجھتے تھے۔'' (انفاس العارفین، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، اردو ترجمہ، حکیم محمد اصغر فاروقی، فضل نور اکیڈمی، چک سادہ شریف، گجرات، اشاعت اول، 1970، ص95)

صوفی احمد جان صاحب فریدی کا بیان ہے کہ 9/ذی الحجہ 1294ھ کو ریاست جھل مگسی (بلوچستان) کے فرمانروا نواب قیصر خان مگسی خواجہ غلام فرید چاچڑوی کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت ہوئے اور جب واپس تشریف لے گئے تو انھوں نے اپنی تمام گھوڑیوں میں سے عمدہ نسل کی خوبصورت گھوڑی جو 'ناز پری' کے نام سے موسوم تھی، مرصع زین اور روپہلی اور طلائی زیورات سے آراستہ کر کے اپنے مختار پائندہ خاں بلوچ کے ذریعے آپ کی خدمت میں روانہ کی اور پائندہ خاں کو ہدایت کی کہ جب آپ سویرے نماز سے فارغ ہو کر کچہری میں تشریف لائیں تو 'ناز پری' کو پیش کر کے درخواست کرنا کہ براہِ کرم اسے اپنی سواری کے لیے قبول فرمائیں۔

پائندہ خاں ایک دوسری گھوڑی پر سوار ہوا اور ملازم 'ناز پری' ساتھ لے کر روانہ ہوا۔ یہ لوگ کئی دنوں کے سفر کے بعد ایسے وقت چاچڑاں شریف پہنچے کہ اکثر لوگ سو چکے تھے۔ پائندہ خاں نے گھوڑی مع مرصع زین اور طلائی زیورات میاں نور محمد نگہبان اسپاں کے حوالے کی اور خود مہمان خانے میں کھانا کھا کر سو گیا۔

اس بات کا نواب قیصر خان کو علم تھا اور نہ ہی پائندہ خان کو کہ جھل مگسی کا ایک نامی گرامی چور نندو خان مگسی عرصہ سے اس گھوڑی کی تاک میں تھا۔ پائندہ خان اسے لے کر روانہ ہوا تو وہ بھی تعاقب میں چل پڑا مگر پائندہ خان کی احتیاطی تدابیر نے اسے راستے میں گھوڑی چرانے کا موقع نہ دیا۔ یہاں فقیر کا اصطبل تھا، کسی کو یہ وہم بھی نہ ہو سکتا تھا کہ کوئی اس کے مال پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت کرے گا۔ اس لیے تمام نوکر چاکر پڑے بے خبر سوتے تھے۔ نندو خان کو موقع مل گیا، وہ دیوار پھلانگ کر اصطبل میں داخل ہوا، پہلے اس نے قفل توڑ کر نگران کی کوٹھی سے مرصع زین اور نقرئی زیورات نکالے، گھوڑی کی پیٹھ پر جلدی سے زین رکھ کر ساز پہنائے اور پھر پھاٹک کا قفل توڑ کر گھوڑی کو لے اڑا۔ جب سرائے کے بڑے دروازے سے گزرا تو

پہرے دار بھاگ کر گھوڑی سے لپٹ گیا اور چور چور کی صدا بلند کی۔ سرائے مہمانوں سے بھری پڑی تھی اور پائندہ خان بھی وہیں سو رہا تھا۔ شور سن کر سب لوگ جاگ پڑے اور چور کا تعاقب کر کے اسے گھوڑی سمیت پکڑ لیا۔

صبح کو جب خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ اشراق کے بعد محل سرا سے برآمد ہوئے تو چور کو گھوڑی کے ساتھ پیش کیا گیا۔

آپ نے چور سے پوچھا: ''بھائی تم چور ہو؟''

چور نے عرض کیا: ''جی غریب النواز، میں چور ہوں۔''

پھر آپ نے پوچھا: ''تم کہاں سے آئے ہو؟''

چور نے جواب دیا: ''حضور والا! میں جھل مگسی سے آیا ہوں۔''

پھر خواجہ صاحب نے پوچھا: تو جھل مگسی سے پیدل آیا ہے؟ واہ بھئی واہ! جھل مگسی تو بہت دور ہے۔''

چور نے عرض کیا: ''میں نے اس گھوڑی اور سنہری روپہلی زیورات اور مرصع زین کے لیے رات دن سفر کیا۔''

آپ نے بڑی نرمی سے پوچھا کہ ''تم گھوڑی پر سواری کر سکتے ہو؟''

چور بولا: ''ہاں جناب! میں بلوچ ہوں اور گھوڑیوں کا سوار ہوں۔''

اس وقت پائندہ خان نے پہچان لیا کہ یہ تو نندو بلوچ ہے۔ بلوچی لباس، ڈھال تلوار سے لیس، بہت بڑی شلوار پہنی ہوئی اور بیس گز کی پگڑی سر پر۔ آپ نے فرمایا:

''اچھا دوست! تم اس گھوڑی پر سوای کر کے دکھاؤ۔'' نندو خان آپ کو سلام کر کے گھوڑی کی طرف بڑھا، اچھل کر سوار ہو گیا اور یہ جا وہ جا۔ تقریباً نصف گھنٹے کے بعد واپس لوٹ آیا۔ آپ یہ دیکھ کر کہ گھوڑی بڑے ناز و انداز اور جاہ وجلال سے قدم اٹھاتی ہوئی چلی آ رہی ہے، فرمانے لگے: ''جیسے گھوڑی اعلیٰ ہے ویسے ہی سوار بھی عمدہ ہے۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ!''

پھر ارشاد فرمایا کہ ''گھوڑی تو اسے زیب دیتی ہے۔ سبحان اللہ! اتنے میں نندو خان گھوڑی لے کر واپس آ گیا۔'' آپ نے اس کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: ''اگر میں لمبی سی ٹوپی پہن کر گھوڑی پر سوار ہوتا تو یہ الگ روتی اور میں الگ روتا۔ اے جوان! ذرا اپنے سراپا پر نظر ڈالو، کتنے بھلے لگ رہے ہو۔ تم بلوچ خان ہو اور تم نے بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ شلوار پہن کر اور ڈھال تلوار سے لیس ہو کر گھوڑی کی سواری کی ہے۔ سبحان اللہ! جاؤ بھئی! فقیر یہ گھوڑی تجھے نذر کرتا ہے۔''

یہ کلمہ آپ کی زبان مبارک سے نکلا ہی تھا کہ چور بے خود ہو کر گھوڑی سے گر پڑا اور گھسٹتا گھسٹتا آپ کے قدموں کی طرف بڑھا اور والہانہ انداز سے پائے مبارک پر بوسے دینے لگا۔ آپ نے بسم اللہ پڑھ کر نندو کو اٹھایا اور سینے سے لگا کر شفیق باپ کی طرح اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا: ''بیٹا مبارک ہو'' میں خود حیران تھا کہ ایسا شہباز ان گھٹیا کاموں میں کیوں لگا ہوا ہے۔''

اسی وقت چور نے چوری سے توبہ کی اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے اللہ والوں کی صف میں شامل ہو گیا۔ اس نے ساری عمر خواجہ صاحب کے قدموں میں بسر کی اور مرشد کی توجہ سے نندو خان کے بجائے 'نندو لے شاہ' مشہور ہوا۔ میاں جی مٹھا اور میاں جی پیارا اور کئی دوسرے بلوچ ان کے مرید تھے۔ یہ مجذوب درویش بعد وفات کوٹ مٹھن شریف میں ہی سپرد خاک ہوا۔ (شرح دیوان فرید، مولانا نور احمد خان فریدی، قصر الادب، ملتان، جلد 1، ص 30-33)

حاجی فضل احمد مونگا شرق پوری، حضرت میاں شیر محمد شرق پوری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''حضرت صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ سے آج تک یہی ہوتا چلا آ رہا ہے کہ بڑی مسجد حضرت میاں صاحب والی میں نماز باجماعت کے وقت مسنون طریقہ پر رکھی ہوئی داڑھی والے حضرات پیش امام کے پیچھے داہنے ہاتھ اور داڑھی صاف کیے ہوئے یا داڑھی کترانے والے بائیں ہاتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس کے خلاف جو بھی عمل کرتا ہے اس کو روک دیا جاتا ہے۔ ایک دفعہ ایک ذیلدار صاحب گلے میں پستول ڈالے ہوئے حضرت صاحب قبلہ سے ملنے آئے۔ جب وہ مذکورہ مسجد میں نماز باجماعت کے وقت داہنے ہاتھ کھڑے ہونے لگے تو انھیں روک دیا گیا اور بائیں طرف کھڑا ہونے کو کہا گیا۔ ذیلدار صاحب کھڑے تو بائیں طرف ہو گئے لیکن انھوں نے اس بات پر بہت برا منایا اور کہنے والے کو سخت سست کہا۔ نماز سے فراغت کے بعد حضور میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کے پاس آ بیٹھے اور مسکرا کر بڑے ناصحانہ اور میٹھے انداز میں فرمایا: کیوں صاحب آپ بتا سکتے ہیں کہ داڑھی کیوں منڈوائی جاتی ہے؟ پھر خود ہی جواب دیا: اسی لیے نا کہ آدمی کم عمر اور چھوٹا نظر آئے۔ میرے بھائی! چھوٹا بننے کا ارمان ہو تو پھر کھڑا بھی چھوٹوں میں ہونا چاہیے اور چھوٹوں کا مقام بائیں طرف ہے یا پیچھے۔ یہاں تو شریعت مطہرہ اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ آلہ وسلم پر عمل کرنے والے ہی کو بڑا مقام حاصل ہے۔ آپ کو رنج نہیں کرنا چاہیے۔'' (حدیث دلبراں، فضل احمد شرق پوری، مونگہ برادران، شرق پور شریف، اشاعت اول، 1413ھ/1993ء، ص 269)

مثالی کردار:

اگر دینِ حق کے داعی کے قول و فعل میں تضاد ہو، اس کا عمل اس کے قول کی تصدیق نہ کر رہا ہو، دوسرے لفظوں میں وہ اپنی دعوت کا اولین مخاطب

اپنی ذات کو نہ سمجھے تو اس کی دعوت نے دوسروں کے سینوں میں تو کیا انقلاب برپا کرنا ہے، خود اس کی اپنی ذات کے لیے رسوائی کا باعث بن سکتی ہے۔ عمل اور کردار کے ارفع مقام پر فائز رہنے والے ہی تبلیغ دین کے فریضہ کو کما حقہٗ سرانجام دے سکتے ہیں اور انھی کی تبلیغ اثر انگیز اور اثر پذیر ہوتی ہے۔

(انوار عمر، پروفیسر غلام عابد خان، احباب پبلشرز، لاہور، اشاعت اول، ستمبر 1998، ص 239)

صوفیائے برصغیر نے اپنی دعوت کو کامیاب بنانے کے لیے اپنے مثالی کردار سے بھی خوب مدد لی۔ اس سلسلہ میں حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

''یہ ہستیاں (صوفیۂ کرام) اپنے ساتھ دولت کے خزانے نہیں لائی تھیں، لشکرِ جرار ان کے ہمرکاب نہ تھے، فن مناظرہ میں بھی مہارت کا انھیں دعویٰ نہ تھا، ان کے پاس اپنی زندگی کی کھلی کتاب تھی جس کی ہر سطر سے نور عرفان کے چشمے اُبل رہے تھے۔ ان کے پاس اپنی دلربا سیرت اور بے داغ کردار تھا جو پکار پکار کر اسلام کی حقانیت کی گواہی دے رہا تھا۔ ان کی صداقت کی دلیل ان کے نورانی چہرے تھے جو مہر درخشاں کو شرمسار کر رہے تھے۔''

(ضیاء القرآن، پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، 1995ء، جلد 3، ص 239)

خلیق احمد نظامی مشائخ چشت کے تبلیغی طریقہ کار کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''اسلام اور اسلام کے اصولوں کی اشاعت کے لیے جو طریقۂ کار مشائخ چشت نے اختیار کیا تھا وہ مروجہ طریقوں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ زبان سے کسی اصول کی تبلیغ و اشاعت کو بے سود و بیکار سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب تک انسان کی زندگی خود ان اصولوں کی تفسیر نہ بن جائے، کسی کو ان اصولوں سے دلچسپی پیدا نہیں کرائی جا سکتی۔ عمل میں ایک جاذبیت ہے۔ اس کا اثر زیادہ گہرا اور زیادہ پائیدار ہوتا ہے۔'' (تاریخ مشائخ چشت، ص 300)

مقدمہ کشف المحجوب (اُردو) میں حضرت سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ (م 465ھ) کے بارے میں مرقوم ہے کہ اپنے مرشد کامل کے وصال کے بعد آپ نے اپنے وطن غزنی کو خیرباد کہا اور تبلیغ اسلام کا شوق آپ کو کشاں کشاں بت کدۂ ہند میں لے آیا۔ آپ کے ہمراہ آپ کے دوست شیخ احمد سرخسی رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ ابوسعید ہجویری رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ اسلام کے یہ پرجوش مبلغ اگرچہ تعداد میں قلیل تھے لیکن ماحول کی اجنبیت، ساز و سامان کے فقدان اور مخالفین کے تشدد و تعصب کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے تبلیغ اسلام کا فریضہ ادا کرنے کے لیے لاہور کی طرف روانہ ہوئے اور یہ راستہ میں جہاں جہاں ٹھہرے کفر و ظلمت کے اندھیروں میں توحید کی شمعیں فروزاں کرتے آئے۔ جب سرزمینِ لاہور ان نفوس قدسیہ کی قدم بوسی سے مشرف ہوئی اس وقت لاہور میں سلطان محمود غزنوی کا لڑکا سلطان مسعود غزنوی سریر آرائے سلطنت تھا۔ اس کا عہد حکومت 421ھ ہے لیکن لاہور میں آپ کی آمد کے سال کا تعین مشکل ہے۔ اگر آپ کا وصال 465ھ تسلیم کیا جائے تو لاہور میں آپ کے قیام کی مدت 30 سال سے زائد بنتی ہے۔ اس عرصہ میں آپ شب و روز اسلام کی تبلیغ میں مصروف رہے۔ آپ کی بے داغ اور دلکش سیرت، پُرنور شخصیت، آپ کے پُرخلوص دل سے نکلے ہوئے اور دلوں میں اُتر جانے والے مواعظِ حسنہ لوگوں کو کفر و ضلالت کی دلدل سے نکال کر صراطِ مستقیم پر گامزن کرتے رہے۔ جن خوش نصیب لوگوں نے آپ کے دست ہدایت پر اسلام کی بیعت کی، آپ کے فیض نگاہ کی برکت سے ان کی لوحِ قلب پر کلمۂ توحید یوں نقش ہوا کہ صرف وہی تا دم واپسیں اس کی لذت سے سرشار نہیں رہے بلکہ ساڑھے نو سو سال گزرنے کے باوجود ان کی نسلیں بھی اسی ذوق و شوق کے ساتھ اسی کلمۂ توحید کا وِرد کر رہی ہیں اور جب بھی وقت آتا ہے تو پرچم توحید کو بلند کرنے کے لیے بلا تامل، بصد مسرت اپنے سروں کے نذرانے پیش کر دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بندوں کی یہی خصوصیت ہے کہ ان کا پڑھایا ہوا سبق فراموش نہیں ہوتا بلکہ گردشِ لیل و نہار اور حوادثات دہر کے باوجود اس کی سرمستیاں بڑھتی رہتی ہیں، اس کی آب و تاب میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک درویش جس کے پاس نہ خزانہ ہے، نہ لشکر اور نہ دنیوی وسائل ہیں اور نہ جاہ و حشمت، اپنے مصلےٰ پر بیٹھا ہے، اپنے معبود برحق کی یاد میں ہمہ وقت مصروف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے انوار و تجلیات کے نزول کے باعث اسے وہ شان دلربائی عطا کر دی جاتی ہے کہ لوگ اس کے رُخ زیبا کو دیکھتے ہی اپنے 'زنار' توڑ دیتے ہیں، اپنے آبائی عقیدوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ترک کر دیتے ہیں، کل تک جن بتوں کی وہ پرستش کرتے تھے، آج اپنے ہاتھوں سے انھیں ٹکڑے کر دیتے ہیں اور خداوند قدوس کی بارگاہ بے کس پناہ میں سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ ان سجدوں ریزیوں میں انھیں جو لطف، جو سرور، جو کیف میسر ہوتا ہے اس پر وہ اپنا سب کچھ نثار کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ غزنوی خاندان کے باہمت فاتحین نے ممالک فتح کیے، قلعے سر کیے اور شاہی محلات پر اپنے پرچم لہرائے لیکن ہجویر سے آئے ہوئے اس غریب الدیار درویش نے قلوب کو مسخر کیا اور تعصب اور ہٹ دھرمی کے قلعوں کو پیوند خاک کیا۔ جہالت و گمراہی کے پردوں کو سرکا کر حقیقت کے رُخ زیبا کو یوں بے نقاب کیا کہ ہر صاحبِ قلب سلیم دیوانہ وار اس پر سو جان سے نثار ہونے لگا۔ (مقدمہ کشف المحجوب (اردو) پیر محمد کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، اشاعت بیست و چہارم، ص 38-37) **(جاری)**

توسیعی خطبہ

قلم گوید کہ من شاہ جہانم

ذیشان احمد مصباحی☆

مولانا ذیشان احمد مصباحی نئی نسل میں اچھی فکر اور بلند افکار و خیالات سے آراستہ نوجوان فاضل ہیں۔2004ء میں جامعہ اشرفیہ مبارک پور سے امتیازی نمبروں سے فراغت حاصل کی اور 2005ء سے مذہبی رسائل و جرائد میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد، کثیر الاشاعت اور مقبول خاص و عام رسالہ ماہنامہ'جام نور' کی مجلس ادارت سے وابستہ ہیں۔جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بی.اے.عربی کے بعد شعبۂ تقابلِ ادیان میں ایم.اے.کیا اور J.R.F. کے امتحان میں کامیابی حاصل کی ہے۔موصوف کی تحریریں مسلسل ہند و پاک کے اہم جرائد و رسائل میں شائع ہوتی ہیں اور قارئین سے خراجِ تحسین وصول کرتی ہیں۔اب جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے شعبۂ عربی ادب میں لکچرر کے عہدہ پر مامور ہیں۔10 دسمبر 2011ء بروز سنیچر جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء ذاکر نگر نئی دہلی میں طلبہ شعبۂ دعوت و تبلیغ کے درمیان ان کا تفصیلی توسیعی خطاب ہوا۔ذیل میں اس خطاب کا جامع خلاصہ موصوف کے قلم سے دیگر مدارس کے طلبہ کے افادہ کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔(نوشاد عالم چشتی)

تحریر مذہبی متون کی تخلیق سے لے کر وکی لیکس کے ہنگامے تک طویل سفر طے کر چکی ہے۔اس نے کتنے مذاہب و افکار کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا اور کتنے خیالات و نظریات کو زندہ دفن کر دیا، کتنے فرش نشینوں کے لیے حکومت و اقتدار کی دیواریں مستحکم کیں اور کتنے شہزادوں کے ہاتھوں میں کشکول گدائی تھما دیے۔دین آخر و کامل نے اس کی اہمیت کی شہادت دی اور قرآن مقدس نے قلم کے تقدس کی قسمیں کھائیں۔

اب وقت قلم کی اہمیت و افادیت پر گفتگو کرنے اور مجلس مذاکرہ سجانے کا نہیں ہے،غور یہ کرنا ہے کہ تحریر کی طاقت آج کے اس برقی دور میں کتنی مؤثر ہے؟ تحریر سے انسانیت، دین اور عقیدوں کے پرخچے کس طرح اڑائے جا رہے ہیں اور اگر انسانیت، دین اور عقیدے کو بچانا ہے تو تحریر کا مؤثر استعمال کیسے کیا جا سکتا ہے؟ ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ اس دور کے شعبدہ بازوں نے لفظوں کو یرغمال بنالیا ہے۔ایسے میں با مقصد تحریر کے مشن کے لیے ہمیں بعض انھیں یرغمال شدہ لفظوں کو معنویت کا جامہ عطا کرنا ہوگا۔مثلاً ہمیں انسانیت کے لیے قلم اٹھانا ہوگا اور انسانیت سے مراد قرآن کا وہ تصور انسانی ہوگا جس نے انسانیت کو پوری کائنات پر کرامت بخشی ہے۔ہمیں دین کے نام پر کام کرنا ہوگا اور اس کے لیے ایسی تعبیرات لانی ہوں گی جن سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد کی ترجمانی ممکن ہو۔ہمیں تصوف کی بات کرنی ہوگی لیکن تصوف سے مراد نہ تو فاتحہ خوانی ہو اور نہ تو ہب سے مراد انکارِ عرس و سماع۔تصوف اور صوفیت کا احیا صرف تزکیہ و احسان کے قرآنی و حدیثی مفاہیم کو مرکز نگاہ بنا کر کرنا ہوگا۔ہمیں صحافت کی طرف بڑھنا ہوگا لیکن اس بات کی کوشش بھی کرنی ہوگی کہ جتنی جلدی ہو سکے ظالموں کی چبائی ہوئی ہڈیوں کو اپنے منہ سے نکال پھینکیں اور اپنے ذرائع سے حاصل شدہ صحیح خبروں کی اشاعت کر سکیں۔رہا ایک طالب علم اور نو آموز کا یہ سوال کہ میں اپنی تحریروں سے صالح انقلاب کیسے برپا کروں؟ یا اس انقلاب میں اپنا رول کیسے ادا کروں؟ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ تین باتوں کو ضرور اپنائیں:

(1) علمی رسوخ اور معلومات کی کثرت
(2) تحریر کے فن پر عبور
(3) قوت تفکر اور عقلی شعور جس سے اپنی معلومات کو فن کے ذریعے صحیح وقت پر صحیح ڈھنگ سے پیش کر سکے۔

مذہبی اُفق پر پچھلے سو سالوں سے اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں فاضل بریلوی کی تحریروں کی حکومت ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں علم کی گہرائی، زورِ بیان، قوتِ تفکر اور گہرا شعور موجود ہے۔آپ بہت سی ایسی علمی شخصیتوں سے واقف ہوں گے جو علم کی چوٹی پر تھیں لیکن آج کوئی ان کا نام لیوا تک نہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فن تحریر پر عبور نہیں رکھتے تھے، اور شاید آپ کچھ ایسے نام سے بھی واقف ہوں جو علم کی گہرائی اور فن تحریر میں کمال رکھتے ہوئے بھی گوشۂ گم نامی میں ہوں۔اس لیے کہ ان کے پاس قلمی جنگ کے لیے جس دانائی، شعور اور منصوبہ بندی کی ضرورت تھی اس کی کہیں نہ کہیں کمی تھی۔

سر دست ہمارے سامنے یہ سوال ہے کہ فن تحریر پر عبور کیسے حاصل کیا جائے؟ اس کے لیے چند تدریجی مراحل ہیں:

(1) خوش خط نویسی، جدید دور میں کمپیوٹر ٹائپنگ بھی (2) خطوط نویسی (4) یومیہ نگاری (5) خاطرہ نویسی (6) سفر نویسی (7) خبر نویسی (8) مقالہ نگاری (9) تصنیف و تالیف (10) تحقیق و انکشاف۔

یہ الگ الگ مراحل ہیں، طلبہ کو ترتیب وار نیچے سے اوپر لے جایا جائے تو کامیابی مل سکتی ہے۔تحریر کے مذکورہ تمام مراحل میں سب سے پہلا سوال موضوع کے انتخاب کا ہے، اس کے بعد موضوع کی عناصر بندی، اس کے بعد مواد کی فراہمی، اس کے بعد حسن ترتیب۔یہ سارے امور مرحلہ وار صبر و سکون کے ساتھ سیکھنے کے ہیں۔جو لوگ قلم کی طاقت سے کسی انقلاب انگیزی کی توقع رکھتے ہیں انھیں سب پہلے عجلت اور زر اندوزی دو امراض کا علاج کرنا ہوگا اور صبر و جہد مسلسل کو اپنا تکیہ بنانا ہوگا پھر ان کا قلم بھی بولے گا کہ:

من شاہ جہانم

☆ مدیر: ماہنامہ'جام نور'، دہلی

سید الشہدا امام حسین رضی اللہ عنہ حیات، افکار، تعلیمات

تاج العلما مولانا سید شاہ اولاد رسول محمد میاں قادری برکاتی☆

آں جناب تیسرے امام ہیں، ابوالائمۃ سبط اصغر حضور سید البشر کا لقب مبارک سید و شہید اور کنیتِ شریف ابوعبداللہ ہے۔ (شجرہ واکمال واصابہ وغیرہ)

حضور کے القاب اور بھی ہیں اور سب میں اعلیٰ سید اور سبط جو سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے عطا فرمائے۔ (نور) بیعت طریقت و خلافت، حضرت کو اپنے والد ماجد امیر المومنین مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ سے تھی۔ (النور والبہا وغیرہ)

ولادت مبارک:

اپنے برادر اکبر حضرت سیدنا امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ولادت شریف کے پچاس راتوں کے بعد حمل میں آئے اور شعبان 4ھ کی پانچویں تاریخ منگل کے دن مدینہ منورہ میں ولادت باسعادت ہوئی۔ (شواہد، نور، شجرہ، استیعاب وغیرہ)

حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کے کان میں اذان دی اور ان کے منہ میں لعاب دہن مبارک ڈالا اور دعا دی اور ساتویں دن حسین نام رکھا، اور ایک مینڈھا ذبح کر کے عقیقہ کیا، اور حضرت بتول نے فرمایا ان کے سر کے بال منڈوا کر اس کے برابر چاندی صدقہ دو۔ (نور الابصار وغیرہ)

حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں:

جب حضرت امام حسن پیدا ہوئے، حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا میرے بیٹے کو دکھاؤ تم نے اس کا کیا نام رکھا؟ میں نے عرض کیا حرب، فرمایا بلکہ وہ حسن ہے پھر جب امام حسین پیدا ہوئے، پھر فرمایا مجھے میرے بیٹے کو دکھاؤ تم نے اس کا کیا نام رکھا ہے؟ میں نے عرض کیا حرب فرمایا بلکہ اس کا نام حسین ہے۔ اسی طرح جب تیسرے صاحب زادے ہوئے تو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا مجھے میرے بیٹے کو دکھاؤ تم نے اس کا کیا نام رکھا ہے؟ میں نے عرض کیا حرب، فرمایا بلکہ وہ محسن ہے۔

دوسری روایت میں اس قدر کے بعد یہ زائد ہے۔ پھر فرمایا میں نے ان کے نام حضرت ہارون علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے صاحبزادوں شبر و شبیر مبشر کے نام پر رکھے ہیں۔ (استیعاب)

اور ہمارے جد امجد حضرت سید شاہ حمزہ فص الکلمات میں فرماتے ہیں:
جب حضرت امام حسین پیدا ہوئے حضرت جبرئیل امین نے حضرت سیّدنا ہارون نبی اللہ کے دوسرے صاحب زادے کے نام پر حضرت کا نام شبیر رکھا، زبان عرب میں شبیر کے معنی حسین ہیں، لہٰذا حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ نام مقرر فرمایا، اور عمران بن سلیمان سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا حسن و حسین دونوں اہل جنت کے ناموں سے ہیں۔ اہلِ عرب نے زمانہ جاہلیت میں کسی کا یہ نام نہیں رکھا۔ اور مفضل کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں ناموں حسن و حسین کو چھپائے رکھا، یہاں تک کہ حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے ان دونوں صاحبزادوں کے یہ نام رکھے۔ (تاریخ و صواعق)

فضائل مبارکہ:

ذات اقدس حضرت امام کی مجمع البرکات و مخزن شرائف کمالات تھی، محاسن صوری و معنوی و فضائل ظاہری و باطنی کی جامع۔ مولیٰ علی فرماتے ہیں، امام حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سینے سے لے کر سر تک سب سے زائد اشبہ تھے، اور حضرت امام حسین سینے سے پاؤں تک سب سے زائد اشبہ تھے۔ (استیعاب)

چہرۂ مبارک ایسا چمکتا تھا کہ لوگ اس کی روشنی میں راہ چلتے تھے۔ (شواہد و سنوات)

متعدد اجلہ صحابہ مثل امیر المومنین عمر و امیر المومنین مولیٰ علی و حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم راوی ہیں کہ حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ’’حسن و حسین جوانانِ اہلِ جنت کے سردار ہیں۔‘‘ نیز ارشاد فرمایا: ’’حسن کے لیے میری ہیبت اور سیادت ہے حسین کے لیے میری جرأت و بخشش۔‘‘ نیز ارشاد فرمایا: ’’حسن و حسین دنیا سے میرے دو پھول ہیں۔‘‘ نیز ارشاد فرمایا: ’’حسین مجھ سے ہیں اور میں حسین سے ہوں، اللہ دوست رکھے اسے جو دوست رکھے حسین کو، حسن و حسین سبط ہیں اسباط میں سے۔‘‘ نیز ارشاد فرمایا: ’’میرے اہل بیت میں محبوب تر مجھے حسن و حسین ہیں۔‘‘ نیز ارشاد فرمایا: ’’جس نے حسن و حسین کو دوست رکھا اس نے مجھے دوست رکھا اور جس نے ان سے دشمنی رکھی اس نے مجھ سے دشمنی رکھی۔‘‘

حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں:

میں نے حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کو امام حسین کا لعاب چوستے دیکھا، جیسے آدمی کھجور کو چوستا ہے۔ ایک بار دونوں صاحبزادے حضرات

حسنین اپنے ابِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کشتی کھیل رہے تھے۔ حضور اقدس نے امام حسن سے فرمایا حسین کو پکڑو، حضرت سیدہ نے عرض کیا یارسول اللہ! حضور بڑے کوفرماتے ہیں کہ چھوٹے کو پکڑے۔ حضور نے ارشاد فرمایا یہ ہیں جبرئیل جو حسین سے کہہ رہے ہیں کہ حسن کو پکڑو۔ ایک بار حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت بی بی عائشہ کے کا شانۂ مبارک سے جاتے ہوئے حضرت بتول زہرا کے دولت خانہ سے گزرے کہ امام حسین کے رونے کی آواز سنی تو حضرت بی بی فاطمہ سے ارشاد فرمایا کیا تم نہیں جانتیں کہ اُن کا رونا مجھے اذیت دیتا ہے؟ (شواہد،نور،وصواعق،واسعاف وغیرہ)

سیرت شریفہ:

سیرت مبارکہ حضرت امام عالی مقام کی اپنے جد کریم حضور اقدس علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والتسلیم کی سیرت کریم کی پرتو اور مظہر تھی،علم وعمل زہد و تقویٰ، جودوسخا،شجاعت وفتوت، اخلاق ومروت،صبر وشکر،حلم وحیا وغیرہ صفات مرضیہ وکمالات پسندیدہ میں بوجہ کمال طاق اور مہمان نوازی وغربا پروری واعانت مظلوم وایصال رحم وانعام فقرا ومساکین میں شہرۂ آفاق۔ بہت بڑے فاضل، دین دار،کثرت سے نماز روزہ،وحج ادا کرنے والے تھے۔ پچیس حج پیادہ پا ادا فرمائے۔ حالانکہ حضور کی عمدہ عمدہ سواریاں لے جائی جارہی تھیں، یعنی کوئی اسباب مجبوری نہ تھی۔ (استیعاب وطبقات)

ایک شخص امام حسین کی خدمت میں اپنی کسی حاجت میں مدد چاہنے کے لیے حاضر ہوا، حضرت خلوت میں اعتکاف میں تھے عذر کرادیا پھر وہ امام حسین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے اس کی حاجت پوری فرمادی اور فرمایا خالصاً للہ کسی کی حاجت پوری کردینا مجھے مہینہ بھر کے اعتکاف سے زائد دوست ہے۔ (اسعاف)

ایک بار ایک سفر میں ایک بڑھیا نے حضرت کو اپنی بکری کا کچھ دودھ پلایا، اور پھر اس کا گوشت کھلایا تھا کچھ عرصہ بعد جب وہ بڑھیا قحط سالی سے پریشاں حال مدینہ منورہ میں حاضر خدمت ہوئی تو حضرت نے اسے ہزار بکریاں اور ہزار دینار عطا فرمائے۔ (نورالابصار)

اور معرکہ کربلا یعنی واقعہ شہادت حضرت امام نے جس صبر وضبط، جس استقامت و رضا بالقضا، جس اعتماد علی اللہ تعالیٰ، جس اتباع شریعت غرا، جس اقامت امر بالمعروف ونہی عن المنکر، جس مادی طاقتوں اور دنیاوی قوتوں سے بے خوفی اور قوی مقتدر جل جلالہٗ کی عون وقوت پر توکل اور ظالموں کے ہر طرح کے سخت ترین مظالم برداشت کرنے کے باوجود بھی نہایت استقلال سے کامل اعلان کے ساتھ اظہارِ حق اور فاسق فاجر کے اتباع وتعظیم واعانت سے کامل بے زاری واجتناب وغیرہ فضائل حمیدہ و صفات پسندیدہ کا روشن ثبوت اور اپنے جد کریم علیہ ثم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی امت کو زریں سبق اور ان کی دین و دنیا دونوں کو سنوارنے اور آراستہ کردینے والی درخشاں عملی تعلیم، حضرت امام عالی مقام نے دی وہ اپنی آپ ہی نظیر ہے۔ جس کی شرح وبسط کے لیے دفاتر بھی ناکافی ہیں۔

احادیث کی روایت ھے:

حضرت امام عالی مقام خوردسال تقریباً سات برس کے تھے جو حضور سیدالانام علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام نے وصال فرمایا۔ پھر بھی آپ کو چند ارشادات حضور اقدس بلاواسطہ سنے ہوئے یاد تھے، اور آپ نے روایت بھی فرمائے۔ اصحاب سنن وغیرہ محدثین نے اپنی کتابوں میں آپ کی کچھ حدیثیں تخریج کی ہیں اور آپ اپنے والدین کریمین مولیٰ علی وحضرت سیدۃ النساء بی بی فاطمہ اور اپنے خال ہند بن ابی ہالہ اور امیرالمومنین عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے واسطے سے بھی حضور اقدس سے روایت کرتے ہیں اور آپ سے احادیث کے راوی، آپ کے اخ معظم حضرت سیدنا امام حسن وحضرت ابوہریرہ اور آپ کے صاحب زادے امام زین العابدین اور آپ کی صاحب زادیاں حضرت فاطمہ وسکینہ اور آپ کے پوتے امام محمد باقر اور شعبی وعکرمہ وشیبان الدولی وکرز التیمی وغیرہم ہیں۔ (اصابہ واکمال)

امام ابن حجر المکی قدس سرہٗ الملکی صداعق محرقہ میں آپ کے پوتے حضرت سیدنا امام علی موسیٰ رضا کے واسطے سے آپ سے ایک حدیث روایت کرکے جس کی سند یہ ہے:

"قال الامام علی الرضا حدثنی ابی موسیٰ الکاظم عن ابیه جعفر الصادق عن ابیه محمد الباقر عن ابیه زین العابدین عن ابیه الحسین عن ابیه علی ابن ابی طالب رضی اللّٰه تعالیٰ عنهم قال حدثنی حبیبی و قرة عینی رسول اللّٰه صلی اللّٰه تعالیٰ علیه وسلم قال حدثنی جبریل قال سمعت رب العزة تبارک و تعالیٰ یقول."

فرماتے ہیں کہ امام احمد نے فرمایا اگر میں اس سند کو مجنوں پر پڑھ کر دم کروں تو اس کا جنون جاتا رہے۔ وہ حدیث یہ ہے کہ رب العزت تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: **"لااله الا اللّٰه حصنی فمن قالها دخل حصنی و من دخل حصنی امن من عذابی."**

لا الہ الا اللہ میرا قلعہ ہے، جس نے یہ کہا وہ میرے قلعے میں داخل ہوگیا، اور جو میرے قلعے میں داخل ہوگیا وہ میرے عذاب سے امن میں

ہوگیا۔اور کہا گیا کہ وہ حدیث یہ تھی:''**الایمان معرفة بالقلب و اقرار باللسان و عمل بالارکان.**''

ایمان اتم واکمل دل سے تصدیق ومعرفت اور زبان سے اس کا اقرار اور ارکان دین پر عمل کرنا ہے۔

امام ابن حجر فرماتے ہیں:

شاید یہ دو واقعے ہوں یعنی امام علی رضا نے یہ دونوں حدیثیں روایت فرمائی ہوں۔حضرت امام نے اپنے خلف ارشد آدم آل عبا حضرت سیدنا امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی التماس سے ایک کتاب مراۃ العارفین نام کی تالیف فرمائی جس میں عالم صغیر یعنی حضرت انسان اور عالم کبیر کی باہم مطابقت دکھائی ہے۔ ہمارے جد امجد حضرت اسد العارفین سیدنا شاہ حمزہ عینی قدس سرہٗ نے فص الکلمات میں اس کا ذکر فرمایا اور بطور نمونہ اس کی یہ عبارت نقل فرمائی ہے۔ جو ہم برائے تبرک خود اصل عربی زبان میں یہاں نقل کرتے ہیں۔حضرت امام فرماتے ہیں:

''**کل مافی القلم مجمل فهو فی روحه مجمل و کل مافی اللوح مفصل فهو فی قلبه مفصل و کل مافی العرش مفصل فهو فی جسمه مفصل و کل مافی الکرسی مفصل فهو فی نفسه مفصل فمن عرف نفسه فقد عرف ربه و عرف جمیع الاشیاء ففکرک یا ولدی فیک یکفیک فلیس شی خارجاً عنک اماتسمع کیف یقول الحق سبحانه، اقرأ کتابک کفیٰ بنفسک الیوم علیک حسیبا فمن قرأ هذا الکتاب فقد علم ماهو کان وماهو یکون فان لم یقرأ تمامه فاقرؤا ماتیسر منه الاتری فکیف یقول تعالیٰ سنریهم اٰیتنا فی الأفاق و فی انفسهم حتی یتبین لهم انه الحق و کیف قال و فی انفسکم افلاتبصرون.**''

بعض کمات شریف:

ایک بار حضرت سے اور امام حسن سے کسی بارے میں کچھ گفتگو آ کر درمیان میں کچھ رکاوٹ واقع ہوگئی، عرض کیا گیا کہ امام حسن آپ کے بڑے بھائی ہیں۔آپ تشریف لے جا کر انھیں منالیں، فرمایا میں نے سنا اپنے جد کریم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہ جن دو شخصوں میں کچھ شکر رنجی ہوجائے۔ پس ایک ان میں کا دوسرے کو منالے تو جو اس میں سبقت کرے گا وہی جنت میں آگے جائے گا، اور میں اسے ناپسند کرتا ہوں کہ اپنے بڑے بھائی پر دخول جنت میں سبقت کروں۔حضرت کا یہ فرمانا امام حسن کو پہنچا اور انھوں نے تشریف لاکر حضرت کو راضی کرلیا۔ ایک بار حضرت نے خطبہ فرمایا اس میں ارشاد فرمایا:

اے لوگو! رغبت کرو برگزیدہ صفات کے حصول میں اور دوڑ و غنیمتوں اور اس نیکی میں اجر کی اُمید نہ رکھو جس میں تم نے جلدی نہ کی۔یعنی نیکی کرنے میں جلدی کرو دیر نہ لگاؤ اور داد و دہش سے تعریف و مدح کماؤ اور ناجائز باطل باتوں سے نام آوری نہ چاہو اور جان لو نیکی حمد کماتی ہے، اور آخرت میں اُجر دلاتی ہے۔پس اگر تم نیکی کو کسی آدمی کی صورت میں دیکھ سکتے (یعنی اگر نیکی آدمی کی صورت بنے) تو بیشک تم اسے اس طرح دیکھو گے کہ وہ بہت حسین وجمیل ہے۔ جسے دیکھ کر لوگ خوش ہوتے ہیں اور اگر تم برائی کو آدمی کی صورت میں دیکھو تو بے شک تم اسے مکروہ صورت اس ہیئت میں دیکھو گے کہ دل اس سے نفرت کریں اور آنکھیں اس سے بند ہو جائیں۔

اے لوگو! جس نے داد و دہش کی وہ سردار ہوا اور جس نے بخل اور کنجوسی کی وہ ذلیل وخوار ہوا اور بے شک بڑا سخی وہ ہے جو اسے دیتا ہے، جو اس سے کچھ اُمید نہیں رکھتا اور بڑا درگزر کرنے والا وہ ہے جو باوجود (بدلہ لینے اور سزا دینے پر) قدرت کے معاف کرتا ہے، اور بڑا صلۂ رحم کرنے والا وہ ہے جو اس سے جوڑتا ہے جس نے اسے توڑ دیا اور جو اپنے بھائی سے کوئی نیک سلوک خالص اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے، اللہ اسے اس کی حاجت کے وقت کفایت کرتا ہے۔اور اس سے زائد بلائیں، اس سے دُور فرماتے ہیں، اور جو اپنے بھائی سے کوئی دنیا کی مصیبت دُور کرتا ہے اللہ اس سے آخرت کی مصیبت دُور فرماتا ہے، اور جو اپنے بھائی سے نیک سلوک کرتا ہے اللہ اسے نیک بدلہ دیتا ہے، اور بے شک اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے، اور فرماتے ہیں تمھاری طرف لوگوں کی حاجتیں اللہ کی تم پر نعمتیں ہیں۔پس تم ان نعمتوں سے غمگین اور گراں بار نہ ہو کہ وہ تم پر عتاب ہو جائیں اور فرماتے بردباری، زینت اور وفاداری مروّت اور صلہ نعمت اور بہت مال ہونا بے برکتی۔(یعنی بہت مال جمع رکھنا اور اسے راہِ حق میں خرچ نہ کرنا اور اس کے حقوق ادا نہ کرنا بے برکتی ہے) اور جلدی کرنا بے وقوفی ہے اور بے وقوفی ضعف وکمزوری اور حد سے گزر جانا، ہلاکی اور کمینوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شر اور فاسقوں بدکاروں کی نجاست تہمت میں ڈالنے والی ہے، اور جو اپنے بھائی کو کسی نیکی کے پہنچانے میں جلدی کرے گا کل جب وہ اپنے رب کے حضور حاضر ہوگا تو اسے پائے گا۔

حضرت کے ایک صاحب زادے نے وصال فرمایا، حضرت پر اس سے کچھ اندوہ گینی نہ دیکھی گئی جس پر اعتراض کیا گیا تو فرمایا: ہم اہل بیت اللہ سے مانگتے ہیں پس وہ ہمیں عطا فرماتا ہے۔ پھر جب اللہ تعالیٰ ہماری محبوب چیز میں اس کا ارادہ فرماتا ہے جو ہم پر گراں ہو تو ہم قضائے الٰہی پر

راضی رہتے ہیں۔ ایک دن آپ نے رکن کعبہ سے چمٹ کر یہ دعا فرمائی: اے اللہ تو نے مجھے نعمت دی تو مجھے تو نے شکر گزار نہ پایا اور تو نے مجھ سے بلائیں ڈالیں تو تو نے مجھے صبر کرنے والا نہیں پایا، پھر بھی باوجود ناشکری کے تو نے مجھ سے اپنی نعمت نہ چھینی اور باوجود بے صبری کے تو نے مجھ پر بلاؤں کی شدت ہمیشہ نہ رکھی۔ اے اللہ! تو کریم ہے اور کریم نہیں کرتا مگر کرم ہی۔ حضور مدینہ باسکینہ میں تشریف فرمارہے پھر اپنے والد ماجد امیر المومنین مولیٰ علی کے ساتھ کوفے گئے اور ان کے ساتھ مشاہد میں شریک رہے اور کوفے ہی میں ان کی شہادت تک رہے۔ پھر اپنے بھائی حسن کے ساتھ رہے، یہاں تک کہ انھوں نے خلافت سے جدائی فرمائی اس کے بعد حضرت مدینہ شریف واپس آ گئے اور امیر معاویہ کی وفات تک وہیں قیام فرمارہے۔ یہاں تک کہ یزید مردود نے تخت نشین ہوکر آپ سے اپنی بیعت چاہی اور آپ نے نہ فرمائی، اور حرم الٰہی مکۂ مکرمہ کے دار الامن تشریف لے گئے اور ظالموں نے وہاں بھی نہ رہنے دیا، اور آخر معرکۂ کربلا پیش آیا۔ (اسعاف الراغبین، نور الابصار)

اولادِ امجاد:

صاحب ارشاد کہتے ہیں کہ: حضرت کی چھ اولادیں تھیں: حضرت علی بن الحسین الاصغر الامام زین العابدین اور حضرت علی اکبر کی والدہ ماجدہ لیلیٰ بنت مرہ بن عروہ بن مسعود ثقفی تھیں جو معرکربلا میں شہید ہو گئے، اور جعفر جن کی والدہ قضاعہ تھیں یہ اپنے والد ماجد کی حیات شریف میں انتقال کر گئے تھے نسل ان کی نہیں ہے اور حضرت عبداللہ (جو عوام میں علی اصغر مشہور ہیں) یہ صغیر السن معرکۂ کربلا میں شہید ہو گئے اور حضرت سکینہ ان کی سگی بہن تھیں ان دونوں کی والدہ رباب بنت اامام القیس بن عدی کلیسیہ تھیں اور حضرت فاطمہ (صغریٰ) جن کی والدہ ماجدہ ام اسحاق بنت حضتر سیدنا طلحہ احد العشر ۃ المبشر ہ تھیں۔ (نور الابصار)

اسی کی تائید حافظ عبدالعزیز خنابدی وشیخ مفید عالمان انساب کی تصریحات سے ہوتی ہے۔ (شجرۂ طیبہ)

اور بعض نسابین حضرت کی اولاد ذکور چھ بتاتے ہیں اور اناث میں تیسری صاحب زادی بنام حضرت زینب اور صاحب زادوں میں ایک بنام محمد جو بقول البعض معرکۂ کربلا میں شہید اور بقول بعض اپنے والد ماجد کے سامنے انتقال فرما گئے تھے، اور دوسرے صاحب زادے علی اصغر یا اوسط نام مگر امام زین العابدین وعبداللہ کے علاوہ اور زائد کرتے ہیں اور یہ کہ یہی وہ صاحب زادے ہیں جو عالمِ طفلی میں کسی ظالم کا تیر لگ کر معرکۂ کربلا میں شہید ہو گئے۔ اور حضرت عبداللہ امام کے ساتھ ظالموں سے جہاد فرما کر شہید ہوئے۔ (شجرہ، واسعاف ونور وغیرہ)

بعض کے نزدیک ایک صاحبزادہ عمر نام اور تھے۔ (نور) حضرت فاطمہ صغریٰ کا عقد اول حضرت حسن مثنیٰ ابن امام حسن سے اور ان کے بعد حضرت عثمان کے پوتے عبداللہ بن عمرو سے ہوا اور دونوں سے صاحب اولاد ہوئیں اور حضرت سکینہ کا نکاح حضرت مصعب بن سیدنا بن زبیر اور یکے بعد دیگرے اور کئی شخصوں سے ہوا جیسا کہ تاریخ ابن خلکان میں ہے۔ (اسعاف ونور)

شہادت مبارک:

حضرت سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے یہاں تشریف فرما تھے، ایک فرشتہ پہلے کبھی حاضر نہ ہوا تھا، اللہ تبارک وتعالیٰ سے حاضری کی اجازت لے کر آستاں بوس ہوا۔ حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ام المومنین سے ارشاد فرمایا: دروازے کی نگہبانی رکھو کوئی آنے نہ پائے، اتنے میں سیدنا امام حسین دروازہ کھول کر حاضر خدمت ہوئے اور کود کر حضور پرنور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی گود میں جا بیٹھے، حضور پیار فرمانے لگے، فرشتے نے عرض کی حضور انھیں چاہتے ہیں۔ فرمایا: ہاں عرض کی وہ وقت قریب آتا ہے کہ حضور کی امت انھیں شہید کرے گی اور حضور چاہیں تو وہ مکان حضور کو دکھاؤں؟ جہاں پہ یہ شہید کیے جائیں گے۔ پھر سرخ مٹّی اور ایک روایت میں ہے ریت، ایک میں ہے کنکریاں، حاضر کیں حضور نے سونگھ کر فرمایا: ”ریح کرب وبلاء“ بے چینی اور بلا کی بو آتی ہے۔ پھر ام المومنین کو وہ مٹّی عطا ہوئی اور ارشاد فرمایا جب یہ خون ہو جائے تو جاننا کہ حسین شہید ہوا، انھوں نے وہ مٹی ایک شیشی میں رکھ چھوڑی، ام المومنین کہا کرتیں جس دن یہ مٹی خون ہو جائے گی کیسی سختی کا دن ہوگا؟ چنانچہ ایک روایت میں ان سے مروی ہے کہ حضرت امام کی شہادت کے دن وہ مٹّی خون ہوگئی۔ دوسری میں ہے کہ ان کنکریوں سے خون جاری ہوگیا۔ امیر المومنین مولیٰ علی کرم اللہ وجہ صفین کو جاتے ہوئے زمین کربلا پر گزرے، نام پوچھا لوگوں نے کہا کربلا، یہاں تک روئے کہ زمین آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ پھر فرمایا میں خدمت اقدس حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں حاضر ہوا، حضور کو روتا ہوا پایا۔ سبب پوچھا فرمایا ابھی جبرئیل کہہ گئے ہیں کہ میرا بیٹا حسین فرات کے کنارے کربلا میں قتل کیا جائے گا، پھر جبرئیل نے وہاں کی مٹّی مجھے سونگھائی مجھ سے ضبط نہ ہوسکا اور آنکھیں بہہ نکلیں۔

ایک روایت میں ہے: مولیٰ علی اس مقام سے گزرے جہاں اب امام مظلوم کی قبر مبارک ہے۔ فرمایا یہاں ان کی سواریاں بٹھائی جائیں گی، یہاں ان کے کجاوے رکھے جائیں گے اور یہاں ان کے خون گریں گے۔

آل محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے کچھ نو جوان اس میدان میں قتل ہوں گے جن پر زمین و آسمان روئیں گے۔ آخر وہ عظیم سختی و مصیبت کا دن زمین و آسمان کو رُلا دینے والا دن یزید پلید کے عہد سلطنت سراپا ظلم و بدعت خباثت وشرارت میں آ ہی گیا، اور یزید پلید کے صوبہ ابن زیاد بدنہاد نے سپہ سالار ناہنجار ابن سعد کے ٹڈی دل لشکر ابتر نے کربلا کے میدان میں نہایت ظلم و شقاوت سنگ دلی و بے حیائی کے ساتھ تین دن کے بھوکے پیاسے فاطمہ کے لال علی کی آنکھوں کے تارے محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کے چہیتے پیارے پر چاروں طرف سے نرغہ کرکے ان ہزاروں روباہ منش بلکہ اس سے بدتر بزدلوں، نامرد ظالموں شقیوں نے شیر خدا کے اکیلے شیر دلیر پر تیروں کی بارش اور نیزہ وتلوار کی اندھا دھند یورش کرکے اس امام عالی مقام کو شہید کر ڈالا۔ اللہ اکبر ظالموں کے چاروں طرف کے حملے دفع کرتے کرتے تھک گئے ہیں زخموں سے چور ہیں۔ 33 زخم نیزے کے 34 گھاؤ تلواروں کے لگے ہیں۔ تیر کا شمار نہیں اٹھنا چاہتے ہیں اور گر پڑتے ہیں۔ اسی حالت میں سنان بن انس نخعی شقی ناری جہنمی نے نیزہ مارا کہ وہ عرش کا تارہ زمین پر ٹوٹ کر گرا، سنان مردود نے خولی بن یزید سے کہا سر کاٹ لے اس کا ہاتھ کانپا سنان ولد الشیطان بولا تیرا ہاتھ بیکار ہوا اور خود گھوڑے سے اُتر کر محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جگر پارے تین دن کے پیاسے کو ذبح کیا اور سر مبارک جدا کرلیا۔ حضرت امام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت عاشور 1 رمحرم الحرام یوم جمعہ 61ھ بوقت نصف النہار ہوئی۔

(مراۃ واصابہ، استیعاب وآئینہ صوائق واسعاف وطبقات وغیرہ)

عمر شریف وقت وفات وشہادت میں متعدد اقوال منقول ہیں مگر چھپن برس اور چھ مہینے کی اس وقت عمر شریف ہونا جو صواعق محرقہ میں مذکورہ ہے سن چار ہجری میں ولادت باسعادت ہونے کے اقوال صحیح سے مطابق ہے۔

حضرت ام سلمہ ام المومنین فرماتی ہیں: میں نے نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خواب میں روتے دیکھا اس حال میں کہ آپ کا سر مبارک اور ریش مبارک خاک آلودہ ہے میں نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ فرمایا ابھی حسین قتل کیے گئے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: میں نے ایک دن دوپہر کے وقت حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا بال بکھرے ہوئے گرد آلودہ، دست مبارک میں ایک شیشہ جس میں خون بھرا ہوا، میں نے عرض کیا یہ کیا ہے؟ فرمایا حسین اور ان کے اصحاب کا خون ہے جسے میں آج صبح سے اٹھا رہا ہوں، لوگوں نے اس دن کا خیال رکھا، پھر معلوم ہوا یہ حضرت امام اسی دن شہید ہوئے تھے۔ (صواعق واصابہ وغیرہ)

ترمذی و بخاری وغیرہما حضرت ابن عمر سے راوی ان سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ مچھر کا خون پاک ہے یا نہیں اور دوسری روایت میں ہے یہ دریافت کیا کہ جس شخص نے حج کا احرام باندھا ہے وہ اگر مکھی مار ڈالے تو اس پر کیا بدلہ لازم آئے گا؟ حضرت ابن عمر نے سائل سے دریافت فرمایا تو کہاں کے لوگوں میں سے ہے؟ اس نے کہا عراق والوں میں سے۔ حضرت نے فرمایا: دیکھو تو یہ مجھ سے مچھر کے خون کی نسبت اور دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا کہ مکھی سے حقیر چیز کے قتل کے بارے میں تو فتویٰ پوچھنے آیا ہے۔ حالانکہ یہ لوگ حد سے گزر گئے اور اپنے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بیٹے کو ان کی اس جلالت شان کے باوجود شہید کر ڈالا (یعنی اتنے بڑے جرم کے ارتکاب کے وقت فتویٰ نہ لیا) حالانکہ میں نے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ حسنین میرے دو گلاب کے پھول ہیں دنیا سے۔ (اسعاف)

حضرت امام اور ان کے ساتھیوں نے ایک فاسق فاجر یزید پلید کی بیعت واطاعت نہ اختیار فرما کر انتہائی سختیاں اور تکالیف اور نظر ظاہر میں مال واولاد وجان وناموس سب کی وہ ہولناک ترین تباہیاں و بربادیاں برداشت کرکے ہمارے سامنے جس صبر واستقلال جواں مردی اور حق کے مقابل مادی ودنیاوی طاقتوں سے بے خوفی اور تعمیل احکام الٰہی پر جس ثبات واستقامت کا عملی بے نظیر نمونہ پیش فرمایا۔ آج اس کو ہم اپنا دلیل راہ بنائیں، اور حضرت امام کی بنائی ہوئی اسی شاہراہ پر چلیں تو دارین کی فلاح و صلاح تک ہماری رسائی بعونہ تعالیٰ یقینی ہے۔

بعد شہادت حضرت امام، بعض خبثائے لئام نے تن مبارک پر گھوڑے دوڑا کر لاش مبارک کو روندا کہ سینہ و پشت نازنین کی تمام ہڈیاں ریزہ ریزہ ہوگئیں، لباس مبارک اُتار لیا، خیمہ مبارک اور اہل بیت کرام کا تمام سامان و اسباب لوٹ لیا۔ پھر سر مبارک امام مظلوم وشہدائے مرحوم ابن زیاد کے پاس اور وہاں سے یزید پلید مایہ فساد کے پاس بھیجے گئے اور لاش بے سر نوار دیدۂ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام ودیگر شہدائے کرام وہیں میدان کربلا میں پڑی رہنے دیں۔ دوسرے دن قریۂ عامریہ کے لوگوں نے اسی میدان میں حضرت امام اور سب شہدائے عالی مقام کو دفن کیا۔ (نور وآئینہ)

سر مبارک کے دفن میں بعض کہتے ہیں بقیع شریف قبۂ اہلِ بیت میں جسے نجدی خبث ابن سعود نے حال میں کھود ڈالا دفن ہے اور نور الابصار واسعاف الراغبین میں بہت سے اصحاب کشف وشہود اولیائے کرام وعلمائے عظام سے نقل کیا ہے کہ قاہرہ مصر کے مشہد حسینی میں دفن ہے۔ حضور کے شاعر یحییٰ بن حکم وغیرہ ایک جماعت اور دروازہ مبارک کے نگہبان اسعد ہجری تھے اور نقش انگشتری مبارک لکل اجل کتاب تھا۔ (نور الابصار) □□

(ماخوذ از 'اصح التواریخ')

عظیم دینی مرکز الفورڈ اسلامک سینٹر (برطانیہ) کے چیئرمین، ممتاز سماجی شخصیت

ملک غضنفر علی کا خصوصی انٹرویو

(برطانیہ میں اسلامک مراکز کا تعارف اور ان کا پس منظر)

ملاقاتی: عبدالرزاق ساجد☆

ملک غضنفر علی برطانیہ میں ایک معروف سوشل ورکر ہیں۔ آپ پاکستان سے برطانیہ چلے گئے۔ وہاں آپ ہندو پاک کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے مسلسل کوشاں رہے۔ ان کی کارکردگی کا اعتراف وہاں کا ہر باشعور فرد کرتا ہے۔ ملک صاحب نے برطانوی معاشرے کو ایک طویل عرصے تک بہت قریب سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ برطانیہ میں مسلمانوں کی آمد، مسائل و مصائب، اثرات و نتائج کا انھوں نے بڑی زیرکی اور باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ ان کی یہ خوبی زیر نظر انٹرویو سے واضح طور پر اُبھر کر سامنے آ رہی ہے۔ میرے دیرینہ دوست عبدالرزاق ساجد صاحب ایک منجھے ہوئے صاحبِ بصیرت شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے ملک صاحب سے مختلف سوالات کے تناظر میں جن حقائق پر روشنی ڈالی ہے وہ مسلمانانِ ہندو پاک کی معلومات میں بیش بہا اضافہ کا باعث ہوگا۔ انٹرویو کے بعض مندرجات خالصتاً پاکستانی معاشرے سے متعلق تھے، ہم نے اسے پیش نظر انٹرویو میں شامل نہیں کیا ہے۔ بقیہ انٹرویو قارئین کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ (نوشاد عالم چشتی)

س: یہ مسجد کیسے بنی اور اس کی تکمیل تک آپ کن مراحل سے گزرے؟

ج: الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ۔ سب سے پہلے آپ کا شکریہ کہ آپ تشریف لائے۔ میں الفورڈ اسلامک سینٹر کی ہسٹری بیان کرنا چاہتا ہوں۔ برطانیہ میں الفورڈ اسلامک سینٹر کی طرح ہر مسجد کی ایک جیسی کہانی ہے۔ 60-1950 میں جب انڈیا اور پاکستان سے مسلمان برطانیہ آنا شروع ہوئے تو پہلے یہ خیال تھا کہ یہ افراد کچھ عرصہ یہاں رہیں گے۔ وہ معاشی مسائل کی وجہ سے یہاں آئے تھے۔ ان دنوں مغرب ایک خوفناک جنگ سے گزرا تھا جہاں لاکھوں لوگ جنگ کی نذر ہوئے اور یہاں کی انڈسٹری، انفراسٹرکچر تباہ ہو چکا تھا۔ انھیں بھی مزدوروں کی ضرورت تھی۔ ہم آزادی سے پہلے برطانیہ کا حصہ تھے لہٰذا ہمارے لیے اور ان کے لیے آسانی تھی کہ پاکستانی برطانیہ میں آئیں کیونکہ انگریز ہندوستانی مسلمانوں کے ماضی کو جانتے تھے اور ابتدا میں جو مسلمان یہاں آئے وہ اکنامک مائیگرینٹ تھے۔ اس میں دو چیزیں بڑی دلچسپ ہیں۔ یورپین جب بھی مغرب کے مسلمانوں کی تاریخ لکھیں گے تو ایک عجیب و غریب پس منظر نظر آئے گا۔ یہاں مسلمان تلوار لے کر نہیں آئے اور نہ مشنری بن کر آئے بلکہ ایک مزدور طبقہ یہاں آیا اور آج یہاں جو دینی رونق ہے اور اللہ و رسول کی آوازیں آتی ہیں اور دلوں کو گرماتی ہیں اور یا رسول اللہ کے نعرے گونج رہے ہیں یہ ان کارکنوں اور غیر ہنر مند افراد کی محنت کا نتیجہ ہے۔ ہمارے پڑھے لکھے افراد کے لیے آسان تھا کہ وہ برطانوی سوسائٹی میں شامل ہو جاتے لیکن جو افراد پڑھے لکھے نہیں تھے وہ کلچر و زبان سے واقف نہیں تھے ان کے لیے معاشرے میں مدغم ہونا آسان نہیں تھا۔ یہ افراد اپنے کنبے اور خاندانوں سے دور تھے اور انھیں ضرورت تھی کہ ایسی جگہ ہو جہاں وہ اللہ کو یاد کرنے کے لیے نمازیں پڑھیں اور دوسرا یہ جگہ ان کی معاشرتی زندگی کا مرکز ہو۔ ہر مسجد کی اسٹوری آپ سنیں گے تو معلوم ہوگا کہ مساجد کی اسٹوری ایک گھر سے شروع ہوتی ہے۔ کسی جگہ ایک گھر خریدا گیا اور کہیں کسی مخیّر شخص اور اللہ کے نیک بندوں نے قربانی دیتے ہوئے اپنا گھر پیش کر دیا۔ ہمارے اسلامک سنٹر کی کہانی بھی اسی طرح کی ہے۔ میں جب 1968ء میں ہیلی فیکس سے اس علاقے میں منتقل ہوا تو اس وقت علاقے میں کوئی مسجد نہیں تھی بلکہ ایک گھر تھا جس کی دو منزلیں تھیں جہاں ہم ایک حصّے کو نماز جمعہ اور تراویح کے لیے استعمال کرتے تھے۔ یہ الفورڈ اسلامک سنٹر کی ابتدا تھی۔

س: وہ کون شخصیت تھیں جن کے گھر نمازیں پڑھی جاتی تھیں؟

ج: ہمارے دوست تھے جناب شیر علی خان صاحب۔ ہمارے دوسرے دوست آدم پٹیل صاحب نے اپنا گھر 70 کیمبرج روڈ پر لیا جو ہم نے تراویح کے لیے دو سال استعمال کیا۔ ہمارے دوست شیر علی خان جو اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں انھوں نے اپنا گھر 23 سال تک دے دیا اور یہ اللہ تعالیٰ کی ان پر خاص عنایت تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ سلم کی کرم نوازی تھی۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی آبادی دو ہزار تھی اور اتنی گہما گہمی نہیں تھی اور فطری طور پر جب مسلمانوں نے دیکھا کہ ان کے بچے جوان ہو رہے ہیں اور ان کی دینی تربیت اور نئی نسل کو دین کی طرف راغب کرنے کے لیے مساجد

ضروری ہیں تو اس کے لیے مسلم آرگنائزیشن بنانے کا فیصلہ ہوا۔ اس طرح مسلم ویلفیئر ایسوسی ایشن کا آغاز 1968ء کے آخر میں کیا گیا۔ ممبر سازی ہوئی تو ہمارے پاس 1970ء تک 140 ممبر تھے جن میں 14 خواتین تھیں اور باقی سب مرد تھے۔ ہمارا اجلاس ہوا اور طے ہوا کہ مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مسجد کی جگہ ہونی چاہیے جہاں کمیونٹی اور دینی سرگرمیاں ہوسکیں۔ مسجد کے لیے 1974ء میں جگہ حاصل کرلی گئی اور مسجد کے لیے درخواست دی گئی۔ تین سال بعد ہماری درخواست مسترد ہوگئی۔ کونسل نے کہا کہ یہ رہائشی علاقہ ہے اس لیے عوامی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کرسکتے اور ہمیں انفورسمنٹ آرڈر ہوا۔ ہمارے لیے شدید پریشانی تھی کہ آبادی زیادہ ہوگئی ہے، رمضان المبارک قریب تھا۔ اللہ تعالیٰ سبب پیدا کرتا ہے۔ ہم آج جس وسیع جگہ پر موجود ہیں یہ چرچ کا حصہ تھی اور یہ چرچ ہال تھا اور بند تھا اور ساتھ برائے فروخت لکھا تھا۔ ہم نے چرچ انتظامیہ سے بات کی کہ یہ جگہ ہمیں کرائے پر دے دیں، مزید مذاکرات بعد میں ہوں گے۔ 1976ء میں ہم نے یہ جگہ کرائے پر لے کر تمام رمضان یہاں گزارا اور مسلمانوں سے اپیل کرتے ہوئے کہا کہ یہ جگہ مسجد کے لیے خریدنا چاہتے ہیں وہ تعاون کریں۔ اس سلسلہ میں مسلمانوں نے تعاون کیا اور یہ چرچ ہال 1978ء میں خرید لیا گیا جس کے بعد پانچ اوقات نماز، مدرسہ اور سوشل، کلچرل سرگرمیاں شروع کردی گئیں۔

یہ اہم بات ہے کہ ہم نے ایک چھوٹے گھر سے مسجد کا آغاز کیا اور پھر وسیع مسجد مکمل کی گئی۔ اس سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ ایک چرچ اور وہ بھی مغرب میں مسلمانوں کو دینا آسان کام نہیں تھا۔ یہاں وہ تمام حقوق ہمیں دیئے گئے ہیں جو مقامی شہریوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ ہمارے حقوق سو فیصد برابر ہیں، تفریق ایک الگ چیز ہے جو ہر معاشرے میں ہوتی ہے لیکن ہمیں وہی حقوق حاصل ہیں جو مقامی افراد کو حاصل ہیں۔ ان کی وسعت قلبی دیکھیں کہ یہاں کا پادری تھا اس نے دیکھا کہ ایک نئی کمیونٹی آئی ہے اسے عبادت کی جگہ کی ضرورت ہے لہٰذا یہ جگہ بیچ دی جائے۔ ہم نے یہ جگہ 40 ہزار پونڈ میں خریدی تھی۔ ہماری ضروریات بڑھتی گئیں اور اس کے ساتھ ایک بنگلہ تھا جو ہم نے 1979ء کے آخر میں 15 ہزار پونڈ میں خرید لیا اور امام کی رہائش کا وہاں انتظام ہوگیا۔ آہستہ آہستہ جمعہ کی نماز میں تعداد 250 تک پہنچ گئی اور یہ اس علاقے میں پہلی مسجد تھی۔ ہم نے نیا آئین تیار کیا، اس دوران بطور کمیونٹی رکاوٹیں بھی پیدا ہوئیں لیکن ہم رکاوٹیں عبور کرتے رہے۔ 1986ء میں ہم نے درخواست دی کہ چرچ کو گرا کر مکمل مسجد تعمیر کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے ہمیں چھ سال لگے۔ وہاں ہم نے محسوس کیا کہ لوکل کونسل اور وہاں کے نمائندے ہمارے لیے رکاوٹ ہیں۔ وہ تاخیری حربوں کے لیے خواہ مخواہ اعتراضات کررہے ہیں۔ ہماری انتظامیہ اور مسلمانوں نے ہمّت نہیں ہاری اور کوشش کرتے رہے بالآخر فروری 1992 میں درخواست منظور ہوگئی۔ 1994 کو ہمارا تفصیلی منصوبہ منظور ہوگیا اور ہم نے چرچ ہال کو 29/اگست 1994 کو گرادیا اور 50 اور 52 نمبر بنگلوں کے صحن اور باغیچے میں ٹینٹ لگا کر مسجد کا عارضی انتظام کیا اور تین سال کے بعد 19/اکتوبر 1997ء کو ہم نئی مسجد میں منتقل ہوگئے۔ اللہ کا انتہائی شکر ہے کہ اس نے ہمیں کامیابی عطا فرمائی۔

س: مسجد میں بچوں، نوجوانوں اور خواتین کے لیے کیا سرگرمیاں ہوتی ہیں؟

ج: 1970ء سے 2011ء تک بہت عرصہ گزر گیا اور اب یہ صورتحال ہے کہ ڈھائی ہزار تک نمازی ہوتے ہیں اور یہاں جگہ نہیں ہوتی، ہمارے پاس 320 بچے پیر سے جمعہ تک پڑھنے آتے ہیں، ہمارے پاس 16 ٹیچر، دو امام ہیں۔ 1970ء سے 2011ء کے عرصے میں بہت تبدیلی ہوئی۔ ہمارا خیال تھا کہ مسجد کی توسیع کے بعد آئندہ دس سال تک مزید جگہ کی ضرورت نہیں پڑے گی لیکن دو سال میں ہم نے محسوس کیا کہ جگہ کم پڑگئی ہے۔ اس علاقے میں 40 ہزار مسلمانوں کی آبادی ہے اور 16 عبادت گاہیں ہیں۔ الفورڈ اسلامک سینٹر پہلی کثیر المقاصد مسجد ہے۔ ہم نے مسجد تعمیر کرلی تو دوسرے مرحلے میں بچوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام تھا۔ اس کے لیے 2003ء میں ایک بنگلے کی جگہ پر مدرسے کی تعمیر شروع کردی جو دو سال بعد تعمیر ہوگیا۔ ہم نے لوکل کونسل سے مذاکرات کرکے ایک کار پارک کی زمین خرید لی اور وہاں ایک مین پونڈ خرچ کرکے ڈے کیئر کمیونٹی سینٹر تعمیر کردیا۔ پھر ہمیں ضرورت ہوئی کہ مسجد نا کافی ہے جس کے بعد ہم نے 50، 52 نمبر بنگلے مکمل گرا کر انھیں مسجد کا حصہ بنا دیا ہے۔ اس طرح پہلے مرحلے میں ڈے کیئر کمیونٹی سنٹر اور چوتھے مرحلے میں مسجد کی توسیع مکمل ہوگئی ہے۔ ہم یہ محسوس کررہے تھے کہ ہمیں اسکول کی ضرورت ہے اور یہ سن کر خوشی ہوگی کہ 21/دسمبر 2010ء کو ہم نے چار سے چھ ایکٹر جگہ خرید لی ہے اور اب وہ ہمارے الفورڈ اسلامک سنٹر کی پراپرٹی ہوگئی ہے وہ ہم فیوچر کے لیے تعلیمی و تفریحی سہولیات کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ہمارے اپنے اسکول ہونے لازمی ہے، ہماری سرگرمیوں میں خواتین اور بچوں کے لیے سہولیات، غیر نصابی سرگرمیوں، کمیونٹی سینٹر میں سیاسی تقریبات شامل ہیں۔ یہاں سیاحتی وفود آتے ہیں، اسکولوں کے دورہ جات ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی کے

طلباء پہنچتے ہیں، بین المذاہب موضوع پر اجلاس ہوتے ہیں۔ ہم کثیر المقاصد سرگرمیوں کے لیے کمیونٹی سنٹر کو استعمال کرتے ہیں، دہشت گردی کے نام پر مسلمانوں کو بدنام کیا جارہا ہے اس پروپیگنڈہ کے توڑ کرنے کے لیے اسلام کے روشن پہلوؤں سے آگاہ کیا جاتا ہے اور الفورڈ سینٹر اسلام کے مثبت پہلوؤں کو اُجاگر کررہا ہے۔ عید میلادالنبی کا سالانہ جلوس نکلتا ہے، بہت بڑی نعت کانفرنس ہوتی ہے۔ یہاں دینی اور سماجی دونوں سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ بچوں کے لیے کراٹے اور باکسنگ کلاسیں ہیں، خواتین کے لیے ورزش کی سہولت موجود ہوتی ہے، سینئر سٹیزن کے لیے پیر سے جمعرات تک کلب ہے۔ یہاں بہت کثیر سرگرمیاں جاری ہیں۔

س: آپ نے گفتگو میں کہا کہ اسلام پر دہشت گردی کا لیبل لگایا جارہا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جو افراد ہشت گردی میں استعمال ہورہے ہیں وہ مسلمان ہیں۔ آپ اس کی وضاحت کیسے کریں گے؟

ج: دیکھیں دہشت گردی کیا ہے۔ ایک آدمی ہے جس نے دنیا نہیں دیکھی وہ گدھے پر بم باندھ کر دس بیس افراد کو ماردیتا ہے، دوسرا آدمی ہے وہ تعلیم یافتہ ہے، مہذب ہے اور جانتا ہے کہ معصوم افراد مارے گئے تو کتنی بڑی زیادتی ہوگی۔ وہ اگر ایف 16 جہاز پر بیٹھ کر ایک بٹن دباتا ہے اور نیچے 200 بے گناہ افراد مرجاتے ہیں تو بتائیے زیادتی کون کررہا ہے۔ جو آدمی بھی بے گناہ افراد کو مارے گا وہ جہاز یا گدھے پر بیٹھا یا اس نے گلے میں بم باندھا ہو اس کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ جہاں ناانصافی ہو اس کے خلاف کھڑا ہونا لازمی ہے خواہ وہاں معاملہ آپ کے خلاف ہوجائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پوری زندگی کا مشاہدہ کرلیں انھوں نے کسی جانور کو بھی تکلیف نہیں دی ہوگی۔ میری غیروں کے ساتھ جن میں عیسائی اور یہودی شامل ہیں، کے ساتھ بحث ہوتی ہے تو میں کہتا ہوں کہ کوئی عیسائی ہو، یہودی یا مسلمان ہو تمام خدا کی مخلوق ہیں۔ اس مخلوق کو پیار کرنا ہمارا فرض ہے۔ میں انسان سے نفرت نہیں کرتا اس کے برے عمل سے نفرت کرتا ہوں۔

س: وہ عناصر جو مساجد اور مزارات پر دہشت گردی کرتے ہیں اور کچھ لوگ ان کی مذمت بھی نہیں کرتے۔ آپ ایسے افراد کا کیسے دفاع کریں گے؟

ج: کوئی مسلمان عبادت گاہوں کو نہیں جلاسکتا۔ رسول اللہ کی یہ تعلیم تھی کہ نجران سے وفد آتا ہے اور صحابہ ناراض ہوجاتے ہیں جبکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم فرماتے ہیں کہ آپ مسجد نبوی میں اپنی عبادت کرلیں۔ ہمارے آقا ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمت للعالمین ہیں ہم تو آپ کے پیروکار ہیں لہٰذا یہ حرکتیں ہماری نہیں ہوسکتیں۔ کسی عبادت گاہ کو برباد اور تباہ کرنے کا کوئی دفاع نہیں کرسکتا اور اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔

س: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشن سیرت کا پہلو جس کی آپ مثالیں دے رہے ہیں اس کی عملی صورت کسی اسلامی ملک میں نظر آتی ہے؟

ج: آپ کو عملی صورت نہیں ملے گی۔ دوسال پہلے چرچ والوں نے ایڈ کی اپیل کی اور یہاں پادری نے آکر کہا کہ آپ ہماری اپیل کے حق میں اعلان کریں۔ ہم نے کہا کہ ہم اعلان کردیں گے۔ ہمارے اعلان کے بعد لوگوں نے عطیات دیئے اس سے اگلے دن ان کے 625 پونڈ جو جمع ہوئے تھے وہ چوری ہوگئے۔ ہم نے اجلاس کیا اور فیصلہ کیا کہ ہمارے پاس سوشل فنڈز ہیں ہم اس نقصان کو پورا کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اخبارات نے سرخیاں لگائیں Mosque Helping Church، اس کا فائدہ یہ ہوا کہ پاکستان میں سیلاب کے موقع پر انھوں نے کہا کہ وہ سیلاب کے لیے پیسے دیتے ہیں۔ یہ آپس کا باہمی تعاون ہوتا ہے جو اسلام کی اصل حقیقت ہے۔ ہم اس پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروکار ہیں جو مکہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوتے ہیں اور اس موقع پر ہر کوئی سوچ رہا تھا کہ آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کفار مکہ کے سارے مظالم کا بدلہ لیں گے لیکن آپ نے اس سے انکار کردیا۔ آپ نے فرمایا جو ابوسفیان کے گھر پناہ لے گا اسے بھی معاف کردیا جائے گا۔

س: حضرت داتا علی ہجویری کے مزار پر دھماکہ ہوا تو ایک مذاکرہ ہوا جس میں شرکا نے کہا کہ جس نے دھماکہ کیا اس کا اسلام اور پاکستان سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے کہا کہ جن لوگوں نے خاتونِ جنت کا مزار گرایا تھا وہ کون لوگ تھے۔ اس سوال کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ جنھوں نے ماضی قریب میں ایسے کام کیے وہ آج بھی اس کے لیے تیار ہیں؟

ج: بعض گمراہ لوگ مس لیڈ ہورہے ہیں۔ ایسے لوگوں میں شعور پیدا کرنا ضروری ہے۔ ہمارے برطانیہ میں بہت پرائیویٹ ٹی وی چینل شروع ہوگئے ہیں جو تفرقہ پیدا کررہے ہیں۔ اسلام میں کسی جگہ زبردستی نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک یہودی لڑکا خدمت کرتا تھا۔ اس کا کام آپ کو پانی پلانا یا وضو کرانا تھا۔ ایک مرتبہ وہ بیمار ہوگیا آپ خود اس کے پاس تشریف لے گئے۔ وہ طویل عرصہ آپ کی خدمت میں رہا لیکن

آپ نے ایک مرتبہ بھی اُسے نہیں کہا کہ اسلام قبول کرلے، اس لیے کہ شاید وہ نوکر ہونے کی وجہ سے ڈر کر کلمہ پڑھ لے۔ آپ نے تیمارداری کے موقع پر فرمایا کہ بیٹا کلمہ پڑھ لے۔ اس نے کلمہ پڑھا اور اللہ کو پیارا ہوگیا۔

س: ہمیں برطانیہ میں تمام آزادیاں حاصل ہیں لیکن اس کے باوجود ہماری کمیونٹی میں کمزور پہلو نظر آتے ہیں۔ آپ میڈیا، علما اور جماعتوں میں کس کو اس کا مجرم سمجھتے ہیں؟

ج: چونکہ ہماری کمیونٹی سادہ تھی، انھیں علما کی ضرورت تھی اور وہ دیہات یا شہروں جہاں سے تعلق رکھتے تھے وہاں سے علما لے آئے۔ جو عالم دین آئے ان کی قربانیاں ہیں کہ انھوں نے بڑی مشکل سے وقت گزارا لیکن وہ مغربی معاشرے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ہم اس ملک کے دو فیصد ہیں 98 فیصد غیر مسلم ہیں، ہم انھیں کیا پیغام دیتے ہیں۔ یہاں پہنچنے والے علما انگریزی زبان سے ناواقف تھے۔ اب بھی ہماری 65 فیصد آبادی نئی نسل پر مشتمل ہے، آپ مساجد میں چلے جائیں وہ اپنے ملک کی زبانیں بول رہے ہیں اور وہاں کے مسائل حل کررہے ہیں۔ میں نے شلوار قمیص پہنی ہے اور آپ نے پینٹ شرٹ پہنی ہے دونوں اسلامی لباس ہیں۔ یہاں سعودی عرب کے باشندے نے چوغا پہنا ہوگا اور بنگلہ دیش کے باشندے نے دھوتی پہنی ہوگی اس لیے کہ اسلام شریعت کی حدود میں کلچر کی اجازت دیتا ہے۔ میں نے ایک عالم دین سے کہا کہ یہاں انگریزی زبان انتہائی لازمی ہے تو انھوں نے کہا کہ آپ بچوں کو کہیں کہ اُردو سیکھ لیں۔ میں نے کہا کہ ایک آدمی کے لیے سیکھنا آسان کام ہے کہ پوری کمیونٹی کے لیے سیکھنا آسان ہے۔ میں نے کہا کہ فارسی لنگویج برصغیر میں کیوں اختیار کی گئی، وہ کہنے لگے کہ فارسی مسلمانوں کی بہت بڑی زبان تھی۔ میں نے کہا کہ فارس میں آتش پرست تھے، مسلمانوں نے ان کی زبان کو اختیار کیا۔ یہ لنگویج اس وقت ایڈوانس تھی، کسی ایڈوانس لنگویج کو اختیار کرنے سے اسلام منع نہیں کرتا۔ آج کل کمیونی کیشن کی زبان انگریزی ہے۔ ہم یہاں پر موجود ہیں جہاں ہمارے بچے اسکولوں میں انگریزی پڑھتے ہیں۔ یہ ہماری کمیونٹی کا المیہ ہے کہ علما ہمارے ماحول کو سمجھتے نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری نوجوان نسل تین چار طبقوں میں تقسیم ہوگئی۔ بعض نے کہا کہ ہماری یہاں ضرورت پوری نہیں ہورہی، مائنڈ سیٹ الگ الگ ہیں، ایک بچہ اسکول میں ہر بات پر دلائل مانگتا ہے اور عالم دین کہتا ہے کہ جو وہ کہے اسے ماننا پڑے گا تو وہ بچہ نہیں مانے گا۔ یہاں نوجوانوں اور علما میں بہت سارے اختلافات ہیں، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض تنظیموں نے ہمارے نوجوان کو کیمپس میں اپروچ کیا۔ بہت سارے عرب کام کرنے نہیں پڑھنے آئے تھے، پاکستانی طالب علم ماہر نہیں تھے جبکہ مسجد میں دلائل سے بحث نہیں ہوتی تھی۔ جب کہ کیمپس میں بحث ہوتی ہے تو وہ انھیں قبول کرلیتے ہیں۔

س: آپ کمیونٹی کے لیے کیا تجویز کریں گے کہ وہ کیسے آگے بڑھ سکتی ہے؟

ج: دو چیزیں انتہائی اہم ہیں۔ جب تک آپ خود کو یہاں کی سوسائٹی کا حصہ تصور نہیں کریں گے اور رابطہ نہیں بڑھائیں گے اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتے۔ ہم پاکستان کے لیے اپیل کرتے ہیں تو ہمارے لوگ بے شمار پیسہ دیتے ہیں لیکن ہم کہیں کہ یہاں برطانیہ کے ایک ہسپتال میں بنچ کی ضرورت ہے تو وہ پیسہ نہیں دیں گے۔ مسلم کمیونٹی میں شعور بیدار کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر وہ ایک بنچ دیں جس پر لکھا ہو کہ ''مسلمان کمیونٹی نے عطیہ کیا'' اس کا کتنا اثر ہوگا۔ ان چیزوں سے احساس پیدا ہوگا کہ مسلم کمیونٹی ہماری کیئر کرتی ہے۔ اس کمیونٹی کا آپ حصہ بنیں۔ باہر سے یہاں لوگ پیسہ دے کر تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں اور آپ کو مفت تعلیم ملتی ہے۔ تعلیم کامیابی کی کنجی ہے۔ بغیر تعلیم کے دنیا کے مقابلے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔

س: برطانیہ میں بچوں کی تعلیم کے لیے سہولیات سے ہماری کمیونٹی کس حد تک فائدہ حاصل کررہی ہے؟

ج: نہیں، یہ بہت بڑا المیہ ہے۔ ہماری اکثریت دیہات سے آئی تھی اور ہم تعلیم کی اہمیت نہیں سمجھتے تھے۔ ہمارے لوگوں نے سوچا کہ انھیں مرسڈیز، بی ایم ڈبلیو گاڑیاں اور بینک بیلنس مل گیا ہے جو کافی ہے حالانکہ تعلیم انتہائی لازمی ہے۔ اگر ایک آدمی کے پاس تھوڑی تعلیم ہے تو وہ میکینک اور ڈرائیور بن جائے گا لیکن پائلٹ نہیں بنے گا، آپ تھوڑی تعلیم سے دکاندار بن سکتے ہیں لیکن اکاؤنٹنٹ، سائنسدان اور ڈاکٹر نہیں بن سکتے۔ ہندو پاک کے مسلمانوں کو قانون کے شعبہ اور سیاست میں ہونا لازمی ہے جس کے لیے تعلیم ضروری ہے۔

س: ہمارے ایسے ادارے میں جو کمیونٹی میں شعور پیدا کرسکتے ہیں جیسے آپ کا کمیونٹی سینٹر اور ہمارے ٹی وی چینل۔ کیا یہ ادارے کمیونٹی کی خدمت کررہے ہیں؟

ج: مساجد کے بارے میں ہمارا خیال ہے کہ وہ عبادت کے لیے ہیں، یہ

باقی صفحہ 24 پر

معاشرہ

تعصّب—ایک خطرناک بیماری

ڈاکٹر محمد عباس حیدر چشتی☆

ایک اچھے اسلامی معاشرے کی سب سے بہتر بات یہ ہے کہ وہ عصبیت سے پاک ہو،عصبیت ایک ایسی بیماری ہے جواچھی بھلی سوچ و عقل کے انسان کوانتشارِ ذہنی کا شکار بنادیتی ہے کہ وہ حق بات بھی ماننے کوتیارنہیں ہوتا یایوں کہیے کہ اس کے اندر باطنی طور پر ایسی ٹوٹ پھوٹ ہوچکی ہوتی ہے جس سے اس کا دل و دماغ اپنی مصنفانہ اورتسلیم حق کی صفت کوکھودیتا ہے۔

اسلام نے قرآن مجید اور سنت رسول کے ذریعہ انسانوں کو اس بیماری سے بچنے کا حکم دیا ہے کیونکہ یہ مرض روحانی واخلاقی کئی امراض کا پیش خیمہ ہے اس کے سبب لوگوں میں کئی مہلک امراضِ روحانی لاحق ہوجاتے ہیں جو پاکیزہ نفس کو شدید نقصان پہنچاتے ہیں۔ جیسے حسد، بغض، کسی پر بلاوجہ نظرحقارت ڈالنا، غیبت، بہتان طرازی، سخن کلامی، حق تلفی، اہانت اور زورکلامی کے ساتھ دروغ گوئی کی آمیزش اور تجسّس وغیرہ۔ یہ وہ گناہِ کبائر ہیں جو ہر زمانہ اور ہر امت کے لیے ممنوع قرار دیئے جاتے رہے ہیں اس امت مسلمہ کے لیے بھی قرآن واحادیث اور اقوال صحابہ و بزرگانِ دین کی تعلیمات کی روشنی میں اس مہلک مرض سے بچنے کی سخت تاکیدیں وارد ہیں۔ ایک مومن کے لیے یہ نہایت خطرناک اخلاقی بیماریاں ہیں اوراس کے اندرصدہا صغائرگناہ پوشیدہ ہیں اور یہ سب امراض جیسا کہ عرض کیا گیا ایک گناہِ عظیم یعنی تعصب کے گرد گھومتے ہیں اوراسی کے سبب سے یہ تمام اخلاقی بیماریاں جنم لیتی ہیں، تعصب میں سب سے پہلے بغض وحسد اور بے اعتنائی پیدا ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں ان کی ممانعت آئی ہے۔

چنانچہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

’’انّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قال لاتباغضوا ولاتفاسدوا ولاتدابروا وکونوا عباداللّٰہِ اخواناً ولا یحلُّ لمسلم اَن یھجر أخاہ فوق ثلاثۃِ ایام.‘‘ (بخاری ومسلم)

’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ آلہٖ وسلم نے فرمایا کہ ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو ایک دوسرے سے حسد نہ کرو اور ایک دوسرے سے بے اعتنائی کا اظہار نہ کرو بلکہ اللہ کے مخلص بندے ہوکرآپس میں بھائی بھائی بن کر رہوکسی مسلمان کے لیے ہرگز جائزنہیں ہے کہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ تعلق ختم کرے۔‘‘

اور بدکلامی جوتعصب کی وجہ سے بہت زیادہ پیدا ہوجاتی ہے اس کے متعلق ارشادرسول ہے:

’’عن عبداللّٰہ بن عمر و رضی اللّٰہ عنھما قال لم یکن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم فاحشًا ولا متفحّشَا وکان یقولُ: اِنَّ من خیار کم اَحسَنُکُمُ اخلاقًا.‘‘ (بخاری ومسلم)

’’حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ آلہٖ وسلم بدکلامی سے کوسوں دُور تھے آپ نے بدکلامی کبھی نہیں فرمائی آپ فرمایا کرتے تھے ہم میں بہتر لوگ وہ ہیں جو اخلاق میں سب سے زیادہ بہتر ہیں۔‘‘

شیطان جب کسی قوم سے بڑے مظالم اور گناہ کرانا چاہتا ہے تو اس کے اندر دوسرے افراد کے حق میں تعصب وحسد کے جذبات بھڑکا دیتا ہے، یہی اس کی تحریک ہزار ہا برائی کی جڑ ثابت ہوتی ہے اور تعصب میں انسان اس حد تک آگے بڑھ جاتا ہے جہاں بڑا سے بڑا گناہ اسے گناہ نہیں دکھائی دیتا۔ بظاہر اسباب کچھ بھی ہوسکتے ہیں مگر اصل سبب تعصب ہی ہوتا ہے۔ اسی کے اندر مندرجہ بالا برائیاں پنہاں ہوتی ہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں واقعۂ ہابیل وقابیل (المائدہ-۲۶ تا ۳۰) کا ذکر ہے۔ قابیل نے ہابیل کا قتل کیا یہ بنی نوع انسان کا پہلا قتل تھا جو حسد، بغض، حق تلفی اور تعصب کی بنیاد پر ہوا۔

اس میں سبب ظاہری اقلیما کا حسن تھا جو قابیل کی حقیقی بہن تھی یعنی قابیل واقلیما ایک حمل سے پیدا ہوئے اور ہابیل ولیودا ایک حمل سے (لیودا کم خوب صورت تھی) حضرت آدم کو حکم الٰہی تھا کہ ایک ہی حمل کے دوبچوں کا آپس میں نکاح نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اقلیما ہابیل سے منسوب ہوئیں یہ بات قابیل کو اچھی نہیں لگی اوراسے ہابیل سے حسد وتعصب ہوا اوراس نے ہابیل کو قتل کردیا۔ یہ قابیل کی اپنی خباثت اور اخلاقی بیماری

تھی اس میں اقلیما یا اس کے حسن کا کوئی قصور نہیں تھا، یہ قابیل کا تعصب ہی تھا جس نے اس کی آنکھوں میں ایسی پٹی باندھ دی تھی جس کی وجہ سے اس کو دوسرے (ہابیل) کا حق دکھائی نہیں دیا۔ تعصب کی سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ وہ انسان کے اندر سے حق شناسی اور تسلیم حق کی صلاحیت ختم کر دیتا ہے۔ چنانچہ قوم مصر (قطبی) جو فراعنہ مصر کی قوم تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل پر تعصب کی بنیاد پر بے پناہ ظلم ڈھاتے تھے اور حضرت موسی کے دین کو حق مانتے تھے۔

خود اللہ کے سچے رسول حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے زمانہ کے یہود اور منافقین مدینہ باطنی طور پر آپ کو سچا نبی جانتے اور پہچانتے تھے لیکن تعصب کی وجہ سے آپ پر اخلاص کے ساتھ ایمان نہ لائے تھے۔ قرآن نے ان کی اس باطنی متعصّبانہ روش کا یوں پردہ چاک کیا ہے:

"**اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَہ‘ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ ھُمُ اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْا اَنْفُسَھُمْ فَھُمْ لَایُؤْمِنُوْنَ.**" (انعام: آیت ۲۰)

ترجمہ: جن کو ہم نے کتاب دی وہ اس نبی (محمد صلی اللہ علیہ آلہ وسلم) کو پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، جنھوں نے اپنی جان نقصان میں ڈالی تو وہ ایمان نہیں لایا۔

اسی طرح مشرکین مکہ کے بعض سردار اسلام اور پیغمبرِ اسلام کو باطنی طور پر حق جانتے تھے لیکن اسلام لانے میں اس لیے دیری کر رہے تھے کہ بنی ہاشم ہم سے ہر لحاظ سے آگے بڑھتے جا رہے ہیں اس لیے حضرت ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ نے مکہ کی فتح کے وقت تک جنگ جاری رکھی۔

تعصب کی وجہ سے حق قبول نہ کرنے کے واقعات تاریخ اسلام اور تاریخ عالم میں بھرے پڑے ہیں، خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں قوم یمامہ کے ایک شخص مسیلمہ بن کذّاب نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا۔ اور اس کی قوم اس کی حمایت میں تعصب کی وجہ سے کھڑی ہوگئی اور اہل یمامہ کہتے تھے کہ مضر کا نبی سچا ہے (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ آلہ وسلم) لیکن مضر کے سچے نبی سے ہم کو اپنے قبیلے کا جھوٹا نبی پیارا ہے (معاذ اللہ) (تاریخ اسلام معین الدین ندوی، ج:۲)

یہ ہے تعصب کا کمال کہ اتنی بڑی سچائی کو جانتے ہوئے بھی حق بات تسلیم نہ کرنا۔ یہ سراسر محرومی ہے اور ہر انسان دین وملت اور معاشرہ کے لیے بہت خطرناک بات ہے۔ آج مسلمانوں میں فرقہ بندی اور طبقاتی و علاقائی تعصب جڑ پکڑ گیا ہے اس نے ایک دوسرے کی اچھی خصوصیات کو بھی تسلیم کرنے سے روک دیا ہے اور معاشرتی طور پر بھی مل بیٹھ کر مفاہمت کے ساتھ کسی قضیہ اور مسئلے کے حل کے سارے دروازے بند کر رکھے ہیں۔

آج اگر ہم اقوام عالم خاص طور پر یورپ و امریکہ کو دیکھتے ہیں کہ وہ کس طرح متحد ہو رہے ہیں ناٹو یوروپی یونین وغیرہ بلاک بنا رہے ہیں۔ یہودی و نصاریٰ اور دنیا کی دیگر غیر مسلم قومیں کس طرح متحد ہو کر اور اشترا کی حیثیت سے گروپ کی شکل میں دنیا پر خاص طور پر مسلمانوں پر مظالم ڈھا رہے ہیں تو تعجب ہوتا ہے کہ یہ وہی قومیں ہیں جنھوں نے کبھی آپس میں عالم گیر جنگیں لڑی تھیں۔ ملک کے ملک تباہ کیے تھے جن کے اندر عصبیت کے اتنے رنگ تھے، انگریز، فرانسیسی، جرمن، آرین، غیر آرین Semitic Reces Non Sametic کالے اور گورے کا فرق ایشین وغیر ایشین کا فرق، آج یہ ساری اقوام ایک ہو رہی ہیں اور جس کے رسول و پیغمبر علیہ السلام نے کالے اور گورے کا فرق، عربی و عجمی کا فرق، امیر و غریب کا فرق سب ختم کر دیا ہو اس قوم میں آج تعصب کا مرض دل سے نکلنے کا نام نہیں لیتا۔ حد تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی برادریاں خود ایک دوسرے کو ذات اور پیشہ کا نام لے لے کر ذلیل کرتی رہتی ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر مسلمان کو اسلام کی وجہ سے برابر عزت حاصل ہے۔ **العزة للمسلمين**" یہ سب دل کی اخلاقی اور روحانی بیماری ہے ہم کو اس سے بچنا ہوگا اور اپنے دل کو علاقائی، ذات پات اور ہر تعصب سے بچانا ہوگا۔ دنیاوی اعتبار اور آخرت کی رو سے بھی ایسا کرنا ہم پر لازم ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"**الا واِنَّ فی الجسدِ مضغةً اذا صلحت صلح الجسد كله‘ واذا فسدت فسدالجسد كله‘ الاوهی القلب.**"

(بخاری ومسلم)

خبردار! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اور اگر وہ سلامت ہے تو سارا جسم سلامت ہے لیکن جب وہ مریض ہو جاتا ہے تو سارا جسم مرض (گناہ) کا شکار ہو جاتا ہے۔ یاد رہے جسم میں گوشت کا وہ ٹکڑا دل ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو تعصب کی خطرناک بیماری سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین، علیہم التسلیم۔ ❑❑

مدارسِ اسلامیہ — مسائل وتقاضے

محمد ذاکر حسین نوری مصباحی☆

مسجد نبوی شریف کے چھوٹے مگر مقدس چبوترے سے علوم وافکار کا جو سوتا پھوٹا تھا، پوری دنیا اب تک اس کے فیوض و برکات سے مستفیض ہو رہی ہے۔ یعنی مدارسِ اسلامیہ اسی چبوترۂ مبارک کے پرتو اور اس کے شعبہ جات اسی بحرِ نبوت کی اٹھلاتی نہریں اور بل کھاتی لہریں ہیں، ان کے قیام کا بنیادی مقصد چونکہ نبوی ہدایات کا تحفظ وارتقا اور قرآنی مقاصد کی حفاظت و صیانت اور اسلامی تعلیمات کی اشاعت وترویج ہے، اس لیے زمانۂ نبوت سے آج تک ہر دور میں مدارسِ اسلامیہ نے ماحول ومعاشرہ کے پژمردہ جسم میں عزم وعمل کی تازہ روح پھونکی اور ایمانی چراغ روشن کر کے دنیا والوں کو کج فکری اور غلط روی سے بچنے اور بچانے کا پیغام دیا۔ جب جب دنیا والوں پر شیطانی یلغار اور حیوانی یورش ہوئی مدارسِ اسلامیہ نے ایسی ایسی نادر الوجود اور بے مثل و بے نظیر ہستیاں قوم وملت کے حوالے کی ہیں، جن کے دم قدم کی برکتوں سے لازوال سعادتوں کا سیلاب اُمنڈ پڑا، جو ذرے ان کے زیرِ نگیں آ گئے، رشک ماہتاب، غیرت آفتاب بن گئے اور جو پرخار ذہن ان کے گرویدہ ہو گئے رشکِ گل، غیرتِ چمن زار بن گئے۔

امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ و دیگر اکابرینِ امت، و اساطینِ ملت، کاملینِ فطرت اور بزرگانِ دین سے لے کر گلیوں میں پھر پھر کر تعلیماتِ اسلامیہ کو پھیلانے والے علما وحفاظ انھیں مدارسِ اسلامیہ کے پروردہ و پرداختہ اور مستفیض وفیض یافتہ ہیں جن کی دینی، ملی، سماجی اور مذہبی خدمات واصلاحات کا زمانہ معترف ہے۔ تاریخی اعتبار سے ہر دور میں مدارس اسلامیہ کا وجود ملتا ہے، بلکہ انگریزوں کے تسلط سے قبل ہندوستان کا چپہ چپہ مدارسِ دینیہ کے وجود مسعود سے درخشاں تھا، سلاطینِ ہند، اساطینِ امت مدارس کی سرپرستی بھی کرتے تھے اور اس کے لیے جاگیریں وجائیدادیں بھی مختص کرتے تھے۔ حتیٰ کہ علما کے لیے شاہی خزانوں سے حصہ بھی مقرر تھا، جس کی بدولت علما کو فکرِ معاش سے فارغ البالی بھی تھی اور وہ مکمل انہماک و دلچسپی کے ساتھ دینی مہمات وخدمات میں مصروف ومشغول بھی رہتے تھے۔ نتیجہ گلشنِ دین گل بدخشاں اور اس کی دل آویز خوشبو سے روح معاشرہ معطر اور مشام ملت معطر بھی تھی۔

لیکن سلطنتِ مغلیہ کے سقوط کے بعد انھیں مدارسِ اسلامیہ کو بدن اسلام کی روحِ رواں جان کر انگریز نے سب سے زیادہ نقصان مدارسِ اسلامیہ اور علمائے اسلام کو پہنچایا۔ انگریز کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے کسی نہ کسی بہانے سے آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ مدارسِ اسلامیہ کی عظمتوں اور سطوتوں کو قلوب واذہان سے محو کرنے کے لیے نت نئے اقسام کے ہتھکنڈے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ کبھی ان کو دہشت گردی کا اڈہ اور علمائے اسلام کو دہشت گرد بتایا جا رہا ہے اور کبھی وہاں کی تعلیمات اور نصابِ تعلیم کو تشدد آمیز اور منفی رجحان کا حامل بتایا جا رہا ہے، تو کبھی عصری تعلیم کو لازمی قرار دے کر اسلامی نصاب کی شبیہ بگاڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کبھی ذمہ دارانِ مدارس سے حساب کتاب کے مطالبہ کا ڈھونگ رچا کر اکابرینِ ملت کے اخلاص وللّٰہیت پر ضربیں لگائی جا رہی ہیں، تو کبھی سند یافتگانِ مدارس کو بے روزگار و بیکار بتا کر ان کی ہمتیں پست کرنے کی کاوشیں کی جا رہی ہیں۔ یہ تمام کاوشیں صرف اس لیے ہیں کہ عامۃ المسلمین کے قلوب واذہان مدارس سے بیزار اور خود وہ اس سے دور ونفور ہو جائیں اور ملتِ اسلامیہ کا اسلامی شیرازہ تتر بتر ہو جائے اور دین کے ان مضبوط قلعوں کی جڑوں کو اتنا کھوکھلا کر دیا جائے کہ یہ دوسروں کا محافظ بننے کے بجائے خود اپنی حفاظت کی بھیک مانگنے لگیں۔ ایسے حالات میں جہاں علمائے اسلام کو زندہ دل، بیدار مغز اور ہوشیار ہونا ہوگا وہیں فرزندانِ ملت کو بھی مکمل صبر وشکیب اور ضبط و ہمت کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کی بقا وارتقا، تحفظ وصیانت کے عزم مصمم سے لیس ہو کر ہر طرح کی ایثار وقربانی پیش کرنے کے لیے مستعد وتیار رہنا ہوگا۔

یہ تو بیرونی یلغاروں اور یورشوں کی بات تھی، ذرا درونِ خانہ جھانک کر دیکھیے تو غم واندوہ اور مسرت وشادمانی کے ملے جلے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر آپ نہ رہ سکیں گے۔

آج مدارسِ اسلامیہ کی بہتات ہے، ایک سے بڑھ کر ایک ظاہری شان وشوکت سے لیس مدرسے ہیں، جن میں سے بعض کے اندرونی حالات ناگفتہ بہ ہیں۔ وہ بیروزگارانِ ملت اور جلبِ مال کرنے والوں کے لیے اثاثۂ حیات ہیں اور مقصدیت وافادیت سے مکمل طور پر عاری وخالی ہیں (جن سے ہمیں کوئی لینا دینا بھی نہیں ہے) ہاں ان میں سے بعض ہیں جہاں

☆ **پتہ**: ناظم اعلیٰ جامعہ طیبۃ الرضا، چنتل میٹ، حیدر آباد، اے پی

اچھا خاصہ اسٹاف ہے، فلک شکوہ عمارتیں ہیں، طلبہ کی بھیڑ بھاڑ ہے مگر:

درونِ خانہ اندھیر ہیں کیا کیا — چراغِ رہ گزر کو کیا خبر ہے

آج تعلیم چونکہ روزگار و معاش سے جڑ کر رہ گئی ہے اور اس حوالے سے غیر سنجیدہ نظامِ عمل کے بطن سے ایسی مایوسی اور اُداسی نے جنم لیا ہے کہ اچھے اچھے نباضانِ درس و تدریس دل برگشتہ و مزاج برداشتہ ہو کر اس سے کنارہ کش ہو چکے ہیں۔ اور جو بچے ہیں الا ماشاء اللہ باوضو تیار ہی بیٹھے ہیں، یعنی فروغِ علم کی راہ کی اہم رکاوٹ مسئلہ روزگار بھی ہے۔ ایسے ماحول میں ذمہ دارانِ مدرسہ کو ہوش کا ناخن لینا ہوگا اور اساتذہ کے باب میں فراخدلی اور وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔

بلبلِ شیراز شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے کتنی اچھی اور سچی بات کہی ہے۔ ''مزدورِ خوش دل کند کار بیش'' (خوش دل مزدور زیادہ کام کرتا ہے) لہٰذا، اساتذہ کے دلوں میں خوشیاں ہویداں کرنا ہوگا جس کے لیے ان کی تنخواہیں اتنی ضرور متعین کرنی ہوں گی کہ وہ اپنی ضرورتوں کی بآسانی کفالت کر سکیں اور اپنے گردوپیش میں عزت کی نگاہوں سے دیکھے جانے کے قابل ہو سکیں۔

قوم مسلم مدارس کی ضرورتوں کے نام پر چندہ دیتی ہے اور خوب دیتی ہے، لیکن اپنے قلم کو روک کر یہاں (بشرط گستاخی معاف) میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ چندہ دینے سے قبل اساتذہ مدرسہ کی تنخواہوں پر ایک جھلک ہی سہی ضرور نظر ڈال لیں۔ کیونکہ انتظامیہ جب تک فراخ دل و فراخ نظر نہیں ہوگا اساتذہ کی ہمہ نوعی قدر شناسی نہیں ہوگی۔ تو پھر مستقبل میں مدارسِ اسلامیہ کو اندھیرے میں ڈوبنے سے بچانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا، لہٰذا جلبِ منفعت کرنے والے انتظامیہ سے دست کشی کر لینے ہی میں عافیت ہوگی اور مدارس کے روشن مستقبل کے لیے صحیح اقدام و عمل ہوگا اور جب اساتذہ کی صحیح قدر شناسی ہوگی تو انشاء اللہ اسی حرص میں سہی مستقبل میں اچھے اساتذہ کی فراہمی اور مخلصین کی دستیابی ممکن رہے گی۔ اور قیامت تک یہ کارواں بحسن و خوبی رواں دواں رہے گا ورنہ مستقبل ماضی سے بھی زیادہ ابتر و بدحال ہو سکتا ہے۔

یہاں تک تو بات اساتذہ کے حالاتِ زار کی تھی، اب آیئے ایک عقابی نظر طلبائے مدارس پر بھی ڈالتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں تو کئی حقیقتیں آشکار ہو جائیں گی، بعض نظمائے مدارس نے خیر خواہانِ ملت کی توجہ خاص اپنی جانب مبذول کرانے کے لیے پوسٹرس، پمفلٹس، اور دیگر تشہیری ذرائع میں ایسے دلدوز اور ترحم آمیز جملوں اور تحریرات کو شائع کرنا شروع کر دیا جنھیں پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مدارسِ اسلامیہ ہر طبقے کے لیے نہیں بلکہ صرف اور صرف غربا و مساکین کے نونہالوں کے لیے ہی تعلیمی و تربیتی درسگاہیں ہیں۔ اس سے وہ اہلِ ثروت حضرات کی توجہ مبذول کرانے میں کامیاب تو ہوئے ہیں لیکن خسارہ یہ ہوا کہ مدارسِ اسلامیہ کو 'خیراتی ادارہ' ہونے کا دردناک شرف و اعزاز حاصل ہو گیا جس کی بدولت اہلِ ثروت مخیّر حضرات ایسے اداروں میں اپنے نونہالوں کو شریک کرانے سے عار و ندامت محسوس کرنے لگے۔ حتیٰ کہ متوسط طبقہ بھی ان سے دور و نفور ہو گیا، جس کا انتہائی بھیانک اور مضر اثر یہ ہوا کہ مدارسِ اسلامیہ اعلیٰ ذہن، روشن خیال، عمدہ مزاج اور محنتی طلبا سے خالی ہو گئے اور گھروں کے سب سے شریر اور پراگندہ، اہلِ محلّہ کی نظر میں معتوب، اسکول سے خارج شدہ غبی الذہن، بلکہ بدعقل لڑکوں کی آماجگاہ بن گئے۔ یہ اور بات ہے کہ یہی طلبا قرآن و حدیث کے فیوض و برکات سے معمور ہو کر پیشوائی کے منصب پر فائز اور آفاقی ہو جاتے ہیں، جن کے سامنے دنیوی علوم کی قدآور شخصیتیں بھی زانوے ادب تہہ کرنے میں افتخار و انبساط محسوس کرنے لگتے ہیں۔

بعض نظمائے مدارس نے خیر خواہانِ ملت کی توجہ خاص اپنی جانب مبذول کرانے کے لیے پوسٹرس، پمفلٹس، اور دیگر تشہیری ذرائع میں ایسے دلدوز اور ترحم آمیز جملوں اور تحریرات کو شائع کرنا شروع کر دیا جنھیں پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مدارسِ اسلامیہ ہر طبقے کے لیے نہیں بلکہ صرف اور صرف غرباو مساکین کے نونہالوں کے لیے ہی تعلیمی و تربیتی درسگاہیں ہیں۔

کاش! اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اگر سرمایہ دارانِ ملت بھی اپنے نونہالوں کو عالم دین، فاضل، مفتی، بناتے تو شاید مدارسِ اسلامیہ کی یہ درگت نہ ہوتی بلکہ وہ سرمایۂ افتخار اور اثاثہ صدناز ہوتے اور غریب علما پر بیجا جلب مال کا بے بنیاد الزام بھی نہ ہوتا:

کہنے کو تو بہت کچھ ہے لیکن یہ آغازِ باب تھا

ان تمام حقائق کے باوجود یہ امر مسلم ہے کہ انھیں مدارسِ اسلامیہ نے ملتِ اسلامیہ کے مردہ جسم کو زندہ جاوید کیا ہے اور فرزندانِ ملت کو بیدار کر کے اس قابل بنایا ہے کہ وہ اپنا تشخص، اپنی پہچان باقی رکھ سکیں اور ملت میں اعمالِ حسنہ کے جذبوں کی بہار انھیں کے دم قدم سے قائم و باقی ہے۔ ◻◻

اسلوبِ فیضؔ میں عربی اور فارسی کی اساسی اہمیت

منصورؔ فریدی☆

فیض احمد فیضؔ کا نام اُردو شاعری میں آفاقی شہرت رکھتا ہے۔ سوانحِ فیض کا مطالعہ کرنے والے اس بات سے ناواقف نہیں کہ عربی ان کا ایک خاص مضمون تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری لفظیات کی حد تک عربی و فارسی کے متوازن استعمال سے آراستہ نظر آتی ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ لفظیات کے خصوصی استعمال سے شاعر کے مزاج اور اس کے وطیرۂ بیان کی نمایاں پہچان قائم ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے کسی طویل تمہید کے بغیر اگر ہم اپنے موضوع کی طرف آنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کے موزوں استعمال نے فیضؔ کی شاعری کو ایک منفرد شناخت بخشی ہے۔ نثر ہو یا شاعری، بہرحال الفاظ و تراکیب کے استعمال کی ایک سے زیادہ سطحیں ہوتی ہیں۔ فیضؔ نے عربی و فارسی کو تخلیقی شان کے ساتھ اپنے اسلوب میں جگہ دی ہے۔ ان کے یہاں قدیم روایتی و اصطلاحی الفاظ بھی نئے معنی کے پیکر میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔

فیض احمد فیضؔ کا 'نسخہ ہائے وفا' ہمارے سامنے ہو تو اس کی ورق گردانی ہمیں نہایت آسانی سے یہ بتا سکتی ہے کہ فیض نے اپنے مختلف شعری مجموعے اور تخلیقات کے عناوین میں عربی و فارسی کے برجستہ استعمال سے دلچسپی پیدا کر رکھی ہے۔ مثلاً 'دست تہہِ سنگ'، 'سرِ وادیِ سینا'، 'شامِ شہر یاراں'، 'غبارِ ایّام' یہ تو مجموعے کے نام ہیں۔ کلیات میں شامل کلام کے عناوین ملاحظہ کریں: 'حسن مرہونِ جوشِ بادۂ ناز'، 'عشق منتِ کش قرار نہیں'، 'تہہ نجوم'، 'شورشِ بربط و نے'، 'دامنِ یوسف'، 'عجزِ اہلِ ستم کی بات کرو'، 'یادِ غزال چشماں'، 'ذکر سمن عذاراں'، 'شورشِ زنجیرِ بسم اللہ'، 'یک بیک شورشِ فغاں کی طرح'، 'شرحِ فراق مدحِ لب مشکبو کریں'، 'زنداں زنداں شورشِ انا الحق'، 'محفل محفل قلقلِ مے'، 'دلِ من مسافرِ من'، 'غم بدلِ شکر بہ لب' یہ مثالیں بتا رہی ہیں کہ ہمارا شاعر کسی ثقالت اور تکلّف یا عدمِ روانی کے بغیر عربی و فارسی لفظیات و تراکیب سے کام لینے کے ہنر میں مشاق ہے۔ فیضؔ کو جو مرتبہ ملا ہے شاید کہ اس میں اس کے ہنر کا بھی عمل دخل ہے جس نے تخلیقیت کی بدولت اس کلام کی تاثیر کو یقینی بنا دیا ہے۔

فنّی اعتبار سے قواعد و بلاغت کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ فیضؔ نے بایں انداز لفظیات سے کام لینے میں خاصا تنوع پیدا کیا ہے۔ ان کے یہاں نہ صرف یہ کہ مختلف نوعیت کے خوب صورت اور سہل عربی و فارسی الفاظ آئے ہیں اور حسین تراکیب میں ڈھلتے چلے گئے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں زبردست صوتی حسن، آہنگی و ملائمیت کی شان ملتی ہے، جو ہمارے سامعہ نوازی میں کسی بھی طرح ناکام نہیں۔ انھوں نے عربی الفاظ سے فارسی قاعدے پر نہایت سلیس ترکیبیں بنائی اور استعمال کی ہیں۔ ان کے یہاں تراکیب میں آنے والے الفاظ کا صرف عشق و عاشقی سے ہی نہیں بلکہ بزمیات کے ساتھ رزمیات اور حبسیات سے بھی گہرا رشتہ مشہود ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

هوئی ہے حضرت ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

چشمِ نم جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشقِ پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پا بجولاں چلو

یہ برہمن کا کرم وہ عطائے شیخِ حرم — کبھی حیات کبھی مے حرام ہوتی رہی

الحمد قریب آیا غمِ عشق کا ساحل — الحمد کہ اب صبحِ سعادت ہوئی نازل

ہر گام پہ منزلِ مقصود قدم گیر
ہر لحظہ ترا طالعِ اقبال سوا ہو

اگر ہم قواعدی لحاظ سے دیکھیں تو فیضؔ نے فارسی کے اسمِ حال، اسم فاعل قیاسی وغیرہ کو نہایت عمدگی سے استعمال میں لایا ہے۔ ان کے یہاں ایسی ترکیبیں بھی موجود ہیں جو جار و مجرور، اضافت اور توصیف والی ترکیبیں کہلاتی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ان کے یہاں اضافت در اضافت کی ترکیبوں میں بھی ثقالت و ناملائمیت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ فیضؔ ایسی ترکیبیں بھی لائے ہیں، جو تلمیحی و خطابیہ ہیں، بعض طنزیہ اور ایسی بھی جو اضافتِ مقلوبی یا صفتِ مقلوبی کی مثالیں بنتی ہیں۔ ان کے کلام میں ایسی ترکیب بھی جا بجا موجود ہیں جن میں حسنِ تکرار پایا جاتا ہے۔ استعاراتی تراکیب

☆جونیئر ریسرچ فیلو، شعبۂ اُردو، کالج آف کامرس، پٹنہ-20

اورعربی آمیز تراکیب بھی کلامِ فیض میں کچھ کم نہیں۔ چند ملاحظہ ہو:

یہ شعر حافظِ شیراز اے صبا کہنا
ملے جو تجھ سے کہیں وہ حبیبِ عنبر دوست
خلل پذیر بود ہر بنا کہ مے بینی
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

زنداں زنداں شورِ اناالحق، محفل محفل قلقلِ مے
خونِ تمنّا دریا دریا ، دریا دریا عیش کی لہر
دامن دامن رُت پھولوں کی آنچ آنچل اشکوں کی
قریہ قریہ جشن بپا ہے ، ماتم شہر بہ شہر

یہ جفائے غم کا چارہ ، وہ نجات دل کا عالم
ترا حسن دستِ عیسٰی تری یاد روئے مریم

گر فکرِ زخم کی تو خطاوار ہیں کہ ہم کیوں محوِ مدحِ خوبیِ تیغِ ادا نہ تھے

صبح کی آج جو رنگت ہے وہ پہلے تو نہ تھی
کیا خبر آج خراماں سرِ گلزار ہے کون

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دل ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا

جاں بیچنے کی آئے تو بے دام بیچ دی اے اہلِ مصر، وضعِ تکلّف تو دیکھیے
انصاف ہے کہ حکمِ عقوبت سے پیشتر اِک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھیے

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ انھوں نے خوبصورت، عام فہم عربی الفاظ کو قافیہ کی جگہ دی ہے اور عربی تراکیب سے ردیف کو سجایا ہے۔ فیض نے بعض ایسی علمی تراکیب کو جو اصطلاحی درجہ رکھتی ہیں اور قرآن مقدس سے رشتہ مند ہیں، بعض نہایت ہی پاکیزہ ذہنی کے ساتھ لایا ہے، جس سے کلام میں 'صنعت اقتباس' کی شان بھی نمایاں ہوگئی ہے:۔

ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ
ہر اِک جانب مچا کہرام دار و گیر بسم اللہ
گلی کوچوں میں بکھری شورشِ زنجیر بسم اللہ
جہاں بھی درد دل کی پھر کوئی توقیر بسم اللہ

کسی طرح تو جمے بزم ، میکدے والو!
نہیں جو بادہ و ساغر تو ہاؤ ہو ہی سہی

ہے سینہ سپر ہر غازی کا
کیا خوف ز یورشِ جیشِ قضا
صف بستہ ہیں ارواح الشہداء
ڈر کا ہے کا
ہم جیتیں گے
حقا ہم جیتیں گے
قد جاء الحق وزہق الباطل
فرمودۂ ربِ اکبر
ہے جنت اپنے پاؤں تلے
اور سایۂ رحمت سر پر ہے
پھر کیا ڈر ہے ہم جیتیں گے

اگر توجہ دی جائے تو یہ تلاش بھی دشوار نہ ہوگی کہ فیض کے یہاں تراکیب میں تحت نقاط، فوقِ نقاط اور غیر منقوط یا صفت مہملہ کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں انھوں نے تراکیب کی بندش میں مناسب آہنگ پر بھی توجہ رکھی ہے۔

فیض کی زبان کا ایک سرسری جائزہ ہمیں یہ یقین کرنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ عربی اور فارسی زبانوں سے فیض نے ان کا پروقار آہنگ اور ترنم ریزی کشیدگی، فیض کی نظمیں یا غزلیں پابند ہوں کہ آزاد یا معریٰ ہر جگہ دریا کی سی روانی اور برق رفتاری دکھائی دیتی ہے، اس کے پیچھے بھی عربی اور فارسی کے شعری آہنگ کی برکت موجود ہے۔ بعض نقادوں نے فیض کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ان پر اقبال کے اثرات تسلیم کیے ہیں۔ اقبال کے اثرات کی بنیاد موضوعاتی ہرگز نہیں ہوسکتی ہے بلکہ یہاں اقبال کی مفرس اور معرب زبان دانی کا شجر سایہ دار فیض کے لیے ترغیب مزید کا باعث رہتا ہے۔ بیسویں صدی میں اقبال کے اسلوب کے اثرات فیض، اختر الایمان اور ن۔م۔راشد سب پر بہت گہرے رہے ہیں حالانکہ یہ تمام شعرا الگ الگ مزاج اور افتادِ طبع کی وجہ سے اپنے انداز کے نمائندہ مانے گئے۔ لیکن سب کے یہاں فارسی اور عربی زبان کی جو طلسماتی فضا پیدا ہوئی، اس میں اقبال کا حصہ بہت اہم ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ترقی پسند یا جدید شاعری کی زبان اور اسلوب کا مطالعہ کرتے ہوئے اس پر عربی اور فارسی زبانوں کے اثرات کا بھرپور جائزہ نہیں لیا جاسکتا ہے۔ فیض کی زبان پر بھی اس پہلو سے کوئی تحقیقی یا بھرپور تنقیدی کارنامہ ہمارے سامنے موجود نہیں۔ میرے اس نوشتے کو فیض کی زبان کے نئے لسانی جزیروں تک رسائی کی داستان کی پیش بندی سمجھنا چاہیے۔ □□

ہند-پاک تعلقات

بھارت و پاک ایک دوسرے کے پڑوسی اور ہمسایہ ممالک ہیں۔ اس لیے دونوں کے درمیان امن، خیرسگالی اور دوستانہ تعلقات اور باہمی تجارتی لین دین نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ ابھی حال ہی میں دونوں ممالک کے وزرائے اعظم کی سارک کانفرنس میں ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات کئی حیثیتوں سے دونوں ممالک کے لیے خوش آئند ہے۔ اس پس منظر میں طرفین تعلقات اور اس کے اثرات و نتائج کو اجاگر کرتے ہوئے چند تحریریں اس بار خصوصی موضوع 'ہند-پاک تعلقات' کے تحت پیش کی جارہی ہیں۔ (ادارہ)

ہند پاک تفاہم: وقت کی اہم ترین ضرورت

کلدیپ نیّر☆

ہند پاک تعلقات میں تلخی کم ہورہی ہے۔ لائن آف کنٹرول سے بھک جانے والے فوجی ہیلی کاپٹر کے اسلام آباد سے واپسی سے جس میں چار افسران سوار تھے یہی قیاس لگایا جاسکتا ہے، لیکن یہ میں نہیں سمجھ پایا کہ ہندوستان اور پاکستان نے ہوم سکریٹری سطح کی میٹنگ کیوں مؤخر کردی، جبکہ اسے ہونا چاہیے تھا۔ ہندوستانی پارلیمنٹ کا مقررہ سرمائی اجلاس اس التوا کا کوئی معقول جواز نہیں ہے۔ آخر کوئی چوٹی کانفرنس نہیں تھی اور نہ ہی آسان سفر کے لیے ویزا ضابطوں سے متعلق مباحثہ تھا۔

مانا کہ طرفین تعلقات کی استواری کے خواہاں نہیں ہیں۔ وہ کم ازکم امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن کے دورۂ افغانستان و پاکستان کے نتیجے پر گفتگو کرسکتے تھے۔ موصوفہ کی دھمکی اور انتباہ آمیز لہجے میں کہیں سے نرمی نہیں آئی۔ یہ واضح رہے کہ واشنگٹن وزیرستان میں اپنے لیے پناہ گاہ تعمیر کرنا چاہتا ہے، جہاں شورش پسند عناصر افغانستان میں امریکی اور ناٹو افواج پر حملہ کرنے کے بعد واپس آتے ہیں۔ ہیلری کلنٹن نے نام لیے بغیر ہی پاکستان کو بتادیا ہے کہ کوئی اپنے عقبی صحن میں سانپ پال کر یہ توقع نہیں رکھ سکتا کہ وہ ہمسایوں کو نہیں ڈسیں گے۔ نئی دہلی نے جو عموماً سانپ سے کاٹے جانے کی زد پر رہتا ہے بجا طور پر امریکہ کو صبر سے کام لینے کی تلقین کی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس رویے نے پاکستان کو مع افسران ہیلی کاپٹر کی واپسی پر آمادہ کیا۔

امریکہ کو بھی اپنے عمل پر گہرائی سے سوچنے کی ضرورت ہے، کیونکہ پاکستان کی مشکلات خالصتاً اس کی پیدا کردہ ہیں۔ شورش پسندی بیس سال پرانی ہے۔ واشنگٹن نے اس سلسلے کا آغاز اس لیے کیا تھا کہ وہ سوویت یونین کی کمر توڑنا چاہتا تھا اور اسے کامیابی بھی ملی۔ امریکہ کا واسطہ ایک بار پھر سب سے بڑے شورش پسند گروہ حقانی نیٹ ورک سے پڑا ہے، جس کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے اس نے پاکستان سے کہا ہے، لیکن پاکستان حقانی نیٹ ورک سے بات بھی کررہا ہے۔ پاکستان طالبان کو سزا دینے کی پالیسی ترک کرکے حقانی گروپ سے بات کرنے کے موقف پر اُتر آیا ہے، کیونکہ امریکہ ہی ایسا کررہا ہے۔

دونوں کو ایک دوسرے پر اعتبار نہیں ہے۔ پاکستان کو شک ہے کہ امریکہ ایسا کرنے کی کوشش کررہا ہے۔ واشنگٹن کے ہاتھوں اسامہ بن لادن کے خاتمے کے بعد اس پر اسلام آباد کا اعتماد صفر ہوگیا ہے اور خصوصاً اس لیے کہ اس نے پاکستان کو ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ جس کے ساتھ وہ مستقل خفیہ معلومات میں شرکت کا دعویدار رہے۔

اسلام آباد میں غالب عناصر کو یہ خوش فہمی ہے کہ حقانی نیٹ ورک افغانستان یا ہندوستان کو اپنا نشانہ بنانے کے لیے ان کے اشاروں کا منتظر رہتا ہے۔ حقانی گروپ ایک مختلف منشور رکھتا ہے اور پاکستان کو چاہیے کہ وہ لامتناہی دھماکوں اور وہاں کی مساجد، پولیس اسٹیشنوں اور ملک کی تنصیبات پر ہونے والے حملوں سے اسے جان لے۔

اسلام آباد کے لیے ہلیری کلنٹن کا یہ مشورہ کہ وہ حقانی گروپ کو مہینوں اور برسوں میں نہیں، بلکہ دنوں اور ہفتوں کے اندر ختم کردے، ایک بڑا مطالبہ ہے۔ ایسا تو برطانوی سامراج بھی نہیں کرسکا اور نہ ہی سوویت یونین جن کے مقابلے میں پاکستان ایک چھوٹی طاقت ہے۔ اس کے علاوہ اسلام آباد کو اپنے رہنماؤں کے ردعمل کا بھی پاس ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں بنیاد پرستوں کو ٹھوس

☆ kuldipnayar75@yahoo.com

حمایت حاصل ہوئی ہے اور یہاں تک کہ فوج بھی ان کے اثر سے مبرا نہیں ہے۔

جہاں تک پاکستانی عوام کا تعلق ہے تو وہ دہشت گردی سے اُکتا گئے ہیں اور سماج کے تئیں اس کے رویہ سے بھی۔ اُس کا ایک اشارہ اس نغمے میں ملتا ہے جس نے لاہور اور دیگر شہروں میں طوفان مچا دیا ہے۔ اس نغمے میں پاکستانی سیاسی رہنماؤں کا مذاق اُڑایا گیا ہے۔ یہاں عوام حریت پسند ہیں اور ہندوستان کی طرح آزادی کا لطف اٹھانا چاہتے ہیں۔

اس سے ہند اور پاکستان کے لیے اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ خطے میں امریکی پالیسی کو موضوع گفتگو بنائیں۔ افغانستان کی خودمختاری و آزادی پر تو دورائے ہو ہی نہیں سکتی۔ بدقسمتی سے اسلام آباد نئی دہلی کے ارادوں پر شکوک میں مبتلا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ نئی دہلی افغانستان کے بہانے پاکستان کو گھیرنا چاہتا ہے، اگر اسلام آباد کے شکوک پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو بھی ہندوستان جس کی کوئی زمینی سرحد کابل سے نہیں ملتی، ایسا نہیں کر سکتا۔ کیا پاکستان کو ایران یا سوویت یونین کے پرانے علاقوں پر شک ہے کہ وہ ہندوستان کو اپنی فوجوں کو پرواز کرانے کی اجازت دیں گے۔ کابل کو اسلام آباد کی طرف دیکھنے پر مجبور کرنا نہ حقیقت پسندی ہے اور نہ ہی ممکن ہے۔

سردست ہندوستان افغانستان میں پاکستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ مقبول ہے، کیونکہ نئی دہلی کو ایسا ملک سمجھا جاتا ہے جو افغانستان میں انسانی خدمت اور ترقیاتی کاموں سے آگے کا کوئی مفاد رکھتا ہو۔ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات صدیوں پرانے ہیں، کیونکہ ہندوستان نے افغانستان کے ساتھ اپنے جبر وتشدد کو داخل نہیں ہونے دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ امریکہ میں زیادہ جارحیت آتی جا رہی ہے اور شاید افغانستان سے پوری طرح نہ ہٹے۔ یہ بات اسلام آباد، کابل اور نئی دہلی تینوں کے لیے خطرناک ہے۔ اس خطے میں واشنگٹن کی موجودگی بدشگونی ہے، اس لیے ہندوستان اور پاکستان کو سب سے پہلے مل بیٹھ کر اپنے شکوک وشبہات دور کرنا اور پھر خطے سے غیر ملکی فوجوں کو نکالنے کی تدبیر پر گفتگو میں افغانستان کو شامل کرنے کے طریقے پر غور کرنا چاہیے۔

اس سمت میں پہلے قدم کے طور پر تینوں کو دہشت گردوں سے نمٹنے کے لیے ہاتھ ملانا چاہیے، جس نے خطے میں پیر جما لیے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ لندن کی بجائے اسلام آباد میٹنگ کی تجویز پیش کرے اور متعلقہ ممالک کو مدعو کرے جس میں ایران بھی شامل ہوتا کہ دہشت گردی کے خاتمے کی تدبیر پر تبادلۂ خیال ہو۔ نئی دہلی کو اس معاملے میں اسلام آباد کی مدد کرنی چاہیے۔

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اچھے تعلقات کا کوئی بدل نہیں ہے۔ اس کا احساس دونوں ملکوں کو جتنی جلد ہو جائے ان کے لیے اور خطے کے لیے اتنا ہی اچھا ہے۔ امریکہ نے عراق سے لے کر افغانستان تک پر حملہ کرکے یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اپنی طاقت کام میں لائے گا، چاہے اس کا مطلب کچھ بھی ہو۔ مشرقِ وسطیٰ جنوبی ایشیا کے ممالک نے واشنگٹن کی دھاندلیوں پر کوئی ردِّعمل ظاہر نہیں کیا۔ ایسا نہیں لگتا کہ خطے میں بیداری آ رہی ہے۔□□

(بشکریہ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' 2 نومبر 2011ء، بروز بدھ)

بقیہ:—— ہند-پاک تعلقات: ایک نئی شروعات

دونوں ملک ہر سال پہلی جنوری کو ایک دوسرے کو اپنی نیوکلیائی طاقت کی لسٹ دیتے ہیں۔ بیشک نیوکلیائی راستے پر قدم رکھ کر ہند-پاک نے آپسی جنگ کی طرف سے پیٹھ کر لی ہے۔ اور آج اس سطح پر پہنچ گئے ہیں کہ بے جھجک آپسی تعاون تجارتی سطح پر بڑھانے کی بات کھل کر کر رہے ہیں۔ حال ہی میں پاکستانی کابینہ نے ظاہر کیا کہ وہ جلد ہندوستان کو موسٹ فیورڈ نیشن کا رتبہ عطا کر دے گا۔ ہندوستان نے پاکستان کو یہی درجہ 15 سال پہلے 1996ء میں دیا تھا۔ پاکستان کو اس فیصلے پر عمل کرنے میں شاید ابھی وقت لگے لیکن اس کا یہ خیال ظاہر کرنا ہی اس کے نظریہ میں ایک بہت بڑی تبدیلی کا اشارہ ہے۔ کچھ دن پہلے 35 سال میں پہلی دفعہ پاکستان کے تجارتی وزیر ہندوستان آئے تھے۔ فی الحال دونوں ملک کے بیچ تجارت 3 بلین سے بھی کم ہے۔ ایک امریکی 'تھنک ٹینک' پیٹرسن انسٹی ٹیوٹ فار انٹرنیشنل اکنامک کے مطابق ہند-پاک تجارت کے بیچ اگر رکاوٹیں ہٹا دی جائیں تو یہ 42 بلین تک بڑھ سکتی ہے۔ فی الحال تو اگلے تین سال میں دونوں ملکوں کے تجارتی وزیر نے آپسی تجارت کو 6 بلین سالانہ تک بڑھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ اسی پر بات چیت کے لیے پاکستانی تجارتی سکریٹری دہلی میں اس وقت موجود ہیں۔ یقیناً ہندوستان اور پاکستان اپنے تجارتی تعاون کو پوری طرح سے بڑھانے میں بہت پیچھے ہیں۔ فی الحال تو اس راستے پر اور آگے بڑھنے کے لیے تو صرف وہ ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کر رہے ہیں۔ دنیا کو یقین دلانے کے لیے کہ وہ جنگ کے میدان میں نہیں ہے چاہے وہ جتنی دفعہ ایک دوسرے سے ہاتھ ملائیں انھیں زیادہ تر ملک 'پرمانٹ انیمیز' سمجھتے ہیں۔ ایک نئی شروعات ان کے تعلقات میں شاید تبھی ممکن ہے جب ہند-پاک کی آپسی تجارت دنیا کو یقین دلا دے کہ اب انھیں ایک دوسرے کا دشمن نہیں سمجھا جا سکتا۔□□

(بشکریہ روزنامہ 'انقلاب'، 14 نومبر 2011ء، بروز سوموار)

ہند: پاک تعلقات ایک نئی شروعات؟

مالدیپ میں بھی ملاقات کر کے دونوں وزرائے اعظم نے اپنی بات چیت کے سلسلے میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی

نیلوفر سہروردی☆

کیا واقعی ہندوستان اور پاکستان نے آپسی تعلقات میں بہتری کے لیے ایک نئی شروعات کی ہے؟ مالدیپ میں وزیر اعظم منموہن سنگھ نے یہی اظہار کیا۔ ان کے مطابق ان دونوں ممالک کو ایک دوسرے کے بیچ تعاون بڑھانا چاہیے، اسے ممبئی (2008) میں ہوئی دہشت گردی کے حادثوں کی وجہ سے نہیں روکنا ہے۔ پاکستانی وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی سے مالدیپ میں ہوئی بات چیت کے بعد ڈاکٹر سنگھ نے یہ خیال ظاہر کیا۔ اس میں نئی کیا بات ہے؟ ممبئی حادثات کے بعد سنگھ اور گیلانی کی ملاقات شرم الشیخ، مصر میں 16/ جولائی 2009ء کو ہوئی تھی۔ اس ملاقات کی اہمیت اس کے ہونے میں ہی تھی چونکہ تب ممبئی حادثے کو ایک سال بھی نہیں ہوا تھا۔ اگر دونوں ایک دوسرے سے بات چیت کرنے سے کتراتے تو شاید یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ ہند-پاک کے تعلقات میں بہتری کے حق میں نہیں ہیں۔ سارک کی 16 ویں کانفرنس کی سائڈ لائن پر پہلے سنگھ اور گیلانی نے تھمپو (بھوٹان) میں بات چیت کی۔ (29/ اپریل 2010) یعنی مالدیپ میں سنگھ اور گیلانی ممبئی حادثات کے بعد پہلی دفعہ نہیں ملے۔ اسی بات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ مالدیپ میں بھی ملاقات کر کے دونوں وزرائے اعظم نے اپنی بات چیت کے سلسلے میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی۔ یہ صرف ایک پہلو ہے، ہند پاک کے آپسی تعلقات کا دھیرے دھیرے بہتری کی طرف بڑھنے کا۔ بیشک آج بھی اگر ہندوستان کے کسی کونے میں کوئی دھماکہ ہو جائے تو پہلی انگلی کئی لوگ پاکستان ہی کی طرف اٹھائیں گے۔ یہی رویہ ممبئی (2008) کے حادثات کے بعد اختیار کیا گیا تھا اور اس سے پہلے دسمبر 2001 میں جب پارلیمنٹ کو کچھ دہشت گردوں نے نشانہ بنایا تھا۔ وقت کے ساتھ ہند-پاک کے تعلقات میں مختلف سطح پر کچھ ایسی تبدیلی آئی ہے کہ دونوں طرف کے لیڈروں کو ان کے آگے لگتا ہے سر جھکانا ہی پڑا۔ ایک وقت تھا جب اپنی اپنی تقریر میں دونوں ہی ملک کے لیڈر ایک دوسرے پر الزام لگانے سے نہیں تھکتے تھے۔ اب اگر یہ دوسرے ملک کا ذکر بھی کرتے ہیں تو آپسی مسائل کو سلجھانے کے لیے اور بہتر تعلقات کے نظریہ سے۔ ممکن ہے کئی مسئلوں پر جیسے کہ کشمیر، ہندوستان اور پاکستان کے بیچ کبھی کوئی سمجھوتہ نہ ہو جو دونوں ملک اور دونوں طرف کے کشمیریوں کو قبول ہو۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اب کسی بھی مسئلے کے اوپر دونوں ملکوں کا جنگ کی طرف بڑھنا ناممکن ہے۔ مختلف سطح پر بات چیت جاری رکھ کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دہلی اور اسلام آباد آپسی درار دور کرنے میں لگے ہوئے ہیں، تعلقات بہتر کرنے کے لیے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ایک نظریہ سے دونوں ملک آپسی جنگ والے دور کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ اس دور میں ہندوستان اور پاکستان کے نمائندے کسی تیسرے ملک میں ہو رہی میٹنگ یا کانفرنس میں اگر ایک ساتھ موجود ہوتو ایک دوسرے سے ملنے، ہاتھ بھی ملانے سے بچتے تھے۔ اور اب دو سال میں دو سے زائد مرتبہ دونوں ملک کے وزرائے اعظم کے بیچ ملاقات ہوئی ہے، دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا ہے اور میڈیا کو ضرورت پڑنے پر بیان بھی دیئے ہیں۔ آج کے زمانے میں پاکستانی کرکٹ کھلاڑیوں کا ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے لیے کھیلنا کوئی عجب بات نہیں سمجھی جاتی ہے۔ یقیناً کرکٹ کھیل ایک بہت بڑا بزنس بن گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ زمانہ گزر گیا جب ہند-پاک کے بیچ کرکٹ میچ کے وقت ایک عجیب سی فضا چھا جاتی تھی جیسے کرکٹ نہیں کوئی جنگ ہو رہی ہو۔ چاہے جتنا وقت لگے لیکن اب ہندوستان اور پاکستان کے لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ دنیا کو خاص طور سے کچھ اہم طاقتوں کو دکھلانا کہ اب ان کا ارادہ آپس میں تعاون بڑھانا اور تعلقات بہتر کرنے کا ہے۔ دونوں ہی ملک اپنے آپ کو نیوکلیائی طاقت سمجھتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ امریکہ آج بھی اس کے خلاف ہے۔ اس بات پر توجہ کی ضرورت ہے کہ جب ہندوستان اور پاکستان نے باری باری اپنے نیوکلیائی مقصد کا اعلان کیا تھا تب پوری دنیا میں خبر پھیل گئی تھی کہ دونوں کے بیچ نیوکلیائی جنگ سے دونوں ملک تباہ ہو جائیں گے۔ جنگ کی بات تو دونوں نے تب سے اب تک کی ہی نہیں ہے بلکہ دونوں کے بیچ اس بات پر اتفاق ہے کہ کبھی اس معاملے پر کوئی لڑائی کسی بھی سطح پر نہیں ہوگی۔ اسی کی بنیاد پر ۱۹۹۲ء سے

باقی صفحہ 56 پر

☆ میوروہار، فیس-1، دہلی-91

خصوصی موضوع

ہند-پاک رشتے: تاریخ کا نیا باب کیا ہوگا؟

ماجد جہانگیر☆

آج اس بار کی سارک کانفرنس پچھلی کانفرنسوں سے ذرا مختلف نظر آتی ہے۔ کانفرنس کے اختتام پر ہند پاک کے وزیراعظم نے جس اتحاد اور یکجہتی کا اشارہ کیا ہے، لگتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان ماضی کی تلخیوں کو کم کر کے نزدیک آنے کا من بنا چکے ہیں۔ اس موضوع پر دونوں اطراف ہندوستان اور پاکستان کے دانشوروں کی رائے بھی اب سامنے آنے لگی ہے اور دونوں ممالک کے دانشوروں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ پائے کے سیاسی رہنماؤں کا بھی یہی خیال ہے کہ دونوں ممالک اپنے اپنے مسائل جن میں وہ بُری طرح پھنسے ہوئے ہیں، کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ آج تک نہ صرف سارک کے کئی اجلاسوں میں باہمی دوستی اور تعلق داری کے حوالے سے پیغامات سامنے آئے، لیکن عملی طور پر دُوریوں کو نزدیکیوں میں بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے یا اگر کوششیں کی بھی گئی تو خاطر خواہ مثبت نتائج سامنے نہیں آئے۔ دونوں ممالک نے شرم الشیخ سے لے کر بھوٹان سے ہوتے ہوئے سری لنکا تک کے سفر میں حکمرانوں نے ایک دوسرے کو سمجھنے اور قریب آنے کی کوششیں جاری رکھیں اور لگتا ہے کہ بار بار کی بات چیت کے نتائج کچھ مثبت سامنے آئے اور آج کی سارک کانفرنس میں دونوں ممالک نے دونوں ممالک سے دہشت گردی کو سرے سے ختم کرنے کا عہد کیا ہے۔

کیونکہ پاکستان جو بدترین دہشت گردی سے گزرتے گزرتے بہت کچھ کھو چکا ہے، جبکہ خود ہندوستان کے اطراف واکناف میں بھی دہشت گردی کے اثرات اب بھی قائم ہیں اور ہمسایہ ممالک کو ہدف تنقید بنانے کے باوجود اس ملک میں بھی دہشت گردی کا ماحول موجود ہے۔ سارک کانفرنس میں پاکستانی وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کو وزیراعظم من موہن سنگھ نے امن کا سب سے بڑا انسان قرار دیا ہے جبکہ چند روز پہلے پاکستان نے ہندوستان کو ایک امن پسند ملک قرار دیا تھا۔ ہندوستانی وزیراعظم کے خیر سگالی جذبات کے ردِّعمل میں قومی راجدھانی سے شائع ہونے والے اخبارات نے منموہن سنگھ کے جذبہ خیر سگالی کو زبردست تنقید کا نشانہ بنایا، بلکہ پاکستانی وزیراعظم کے تئیں منموہن سنگھ کے جذبات پر افسوس کا اظہار کیا۔ یہ صرف اخبارات کی بات نہیں بلکہ ملک میں ایسے عناصر بھی موجود ہیں جو دونوں ممالک کی دوستی کو پسند نہیں کرتے ہیں بلکہ دونوں ممالک کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹکراؤ کی راہ پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ دونوں ممالک کے قائدین کا خیال ہے کہ دونوں ممالک میں جو دہشت گردی موجود ہے، وہ کسی کے کنٹرول میں نہیں ہے بلکہ جہاں جہاں دہشت گردی ہے ان کا اپنا ایک ایجنڈا ہے اور دہشت گردی کی وجہ سے ہی دونوں ممالک میں تناؤ اور تضاد موجود ہے۔ دونوں ممالک جب کچھ سال پہلے نزدیک آئے تھے، ممبئی دہشت گردی واقعہ تعلقات کو نزدیک لانے میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوا۔ تعلقات کو بحال کرنے تک چار برس ضائع ہوگئے۔ اب نئے سرے سے تعلقات کو بہتر و خوشگوار بنانے کی شروعات کی گئی ہے، لیکن ایک بات واضح نظر آتی ہے کہ دونوں ممالک سارک کے دوسرے ساتھیوں کے تعاون سے نئی راہوں کی تلاش میں مصروف ہوگئے۔ دونوں ممالک کے وزرائے اعلیٰ نے یہ تک کہا کہ ہم برصغیر میں ایک نئی تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔ اس اعلان کے پس منظر میں شاید یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ برصغیر میں جو بنیادی مسائل تنازع اور تناؤ کی وجہ سے بنے ہوئے ہیں، ان کے حل کا کوئی روشن امکان پیدا ہوگیا ہے۔ □□

دونوں ممالک جب کچھ سال پہلے نزدیک آئے تھے، ممبئی دہشت گردی واقعہ تعلقات کو نزدیک لانے میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوا۔ تعلقات کو بحال کرنے تک چار برس ضائع ہوگئے۔ اب نئے سرے سے تعلقات کو بہتر و خوشگوار بنانے کی شروعات کی گئی ہے۔

(بشکریہ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' 17 نومبر 2011ء، بروز جمعرات)

☆ای میل: jahangir.majid@gmail.com